شب تابی

کوثر چاندپوری

ناشر
جعفری برادرس الہ آباد

مطبوعہ
مطبع انوار احمدی الہ آباد

قیمت فی جلد عہ

۷۸۶

حرفِ اوّل

اِس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ بعض مخصوص اسباب وحالات کی بنا پر ہندوستان
ں جنس اور اس کی حسین ورنگین دلچسپیاں اور رعنائیاں ہمیشہ خمار بن کر جذبات
ر دل ودماغ پر چھائی رہی ہیں لیکن یورپ نے اس خمار کو بحران میں تبدیل کر دیا اور
وجودہ دور میں چند ایسے ادیب وافسانہ نگار پیدا ہو گئے جنھوں نے بعض یورپی مصنفین
ی تقلید میں جنس پرستی ہی کو اپنا شعار اور اپنے ادب کا عنوان بنا لیا انھیں ایسی تخلیقات
ں لطف آنے لگا جن کا موضوع جنس ہو اور ان کی ساری فن کارانہ قوتیں اسی موضوع
صرف ہو گئیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جنسی مسائل کو ترقی پسندی کا ضروری عنصر سمجھا
انے لگا اور حقیقت نگاری کے ذیل میں مختلف جنسی عنوانات پر بھرپور زورِ قلم صرف
ونے لگا۔ اِس میں شک نہیں کہ جنس کو ترقی پسند ادب سے جدا نہیں کیا جا سکتا
ر ایسا کیا گیا تو جنسی اصلاح کی کوئی صورت باقی نہ رہے گی مگر سب سے بڑی گمراہی
جس نے اکثر فن کاروں کو بھی صحیح راستہ سے بھٹکا دیا ہے یہ ہے کہ آرٹ کی بخشی ہوئی
زادیوں کا غلط استعمال کیا جا رہا ہے، اور اصلاحی نقطۂ نظر کو چھوڑ کر لطف آفرینی
ور لذت اندوزی کو مطمح نظر بنا لیا گیا ہے یہی وجہ ہے کہ ان بھٹکے ہوئے ادیبوں کی
تخلیقات صرف جنسی بھوک اور نفسی ہیجانات کا آئینہ بن کر رہ جاتی ہیں۔

ترقی پسند ادب اس بے راہ روی کو کبھی جائز قرار نہیں دیتا، ترقی پسندانہ نقطۂ
نگاہ سے جنسی مسائل پر صرف سماجی حقائق کی توضیح وتشریح کی حد تک ہی گفتگو جائز
رار دی جا سکتی ہے اگر سماجی اور ماحول کے حقیقی اور بنیادی مسائل سے ہٹ کر
ہوانیات پر زورِ قلم صرف کیا جائیگا تو اس کوشش کو ترقی پسندی سے کوئی واسطہ
یہ ایک کھلی ہوئی لذت پرستی ہوگی جسے دوسرے الفاظ میں فحاشی اور عریاں نگاری
تعبیر کیا جا سکتا ہے، جنسی جذبات کو ادب میں ایک مناسب مقام ضرور ملنا
ہیے مگر جنسی مصروفیتوں کا حد سے بڑھ جانا تباہی کا پیش خیمہ ہے ماضی میں
نت الکبریٰ، بغداد اور عہدِ حاضر میں فرانس اس نوع کی بربادی کا ایک عبرت
ز مرقع پیش کرتا ہے، بہر کیف اعتدال کے ساتھ اجتماعی مفاد اور اجتماعی زندگی

کی اصلاح و تعمیر کے لئے جنس جیسی "ناگن" کو چھیڑا جا سکتا ہے لیکن محض تفریح، لذت
اندوزی یا ادیب بنکے ادب کے جنون میں ایسی جرأت خطرہ سے خالی نہیں،
شب ناچے میں زیادہ تر جنسی مسائل پر ہی بحث کی گئی ہے اور کوثر چاندپوری نے
جن کو دنیائے ادب میں ایک سنجیدہ اور معتدل فن کار تسلیم کیا گیا ہے سماج کے سڑے ہوئے
زخموں کو چھیڑ کر انھیں ناسور بن جانے کا موقعہ نہیں دیا بلکہ کہیں تو کوئی ٹھنڈا مرہم رکھ کر
مندمل کرنے کی کوشش کی ہے کہیں "عمل جراحی" کر کے ان کی بیمار سطحوں کو صاف کیا ہے
انھوں نے جنسی مسائل کو سماج کے بنیادی حقائق اور اجتماعی زندگی کے ضروری مسائل
سے وابستہ و ترجمان بنانے کی کوشش کی ہے اور اُن کی یہی خصوصیت ہے جو انھیں بعض
ترقی پسند ادب تسلیم کرنے پر مجبور کر دیتی ہے، ہو سکتا ہے کہ بعض مقامات پر وہ اپنے اس
نظریہ سے ہٹ گئے ہوں مگر یہ امر بالکل یقینی ہے کہ محض لذت پرستی کے لئے انھوں نے جنس
کے آتش فشاں کو نہیں چھیڑا، نہ جنسی ترغیبات میں وہ کوئی دلچسپی محسوس کرتے ہیں،
شب ناچے میں مختلف اوقات میں لکھی ہوئی چیزیں شامل ہیں مگر جہاں تک نقطۂ
نظر کا تعلق ہے اس میں ایک عام یکسانیت پائی جاتی ہے۔

کارکنان مطبع انوار احمدی نے کوثر چاندپوری کی اکثر چیزیں شایع کی ہیں اور وہ
برابر محسوس کر رہے ہیں کہ موصوف اب زندگی اور اس کے بنیادی مسائل تک ہی محدود
ہوتے جا رہے ہیں اور ان ترقی پسندانہ رجحانات کو بڑی بے تعصبی سے قبول کر رہے
ہیں جو ماضی کی ایسی اقدار کی تکذیب نہیں کرتے جن پر وقت اور زمانہ کا کوئی اثر
نہیں پڑتا،

ہمیں معلوم ہے کہ ملک میں ان کی تخلیقات سے کافی دلچسپی لی جاتی ہے اس
لئے یہ توقع غلط نہیں ہے کہ شب ناچے کو بھی وہی قبول عام حاصل ہوگا جو ان کی
دوسری تصانیف کے حصہ میں آچکا ہے،

ناچیز

سید عبد الواسع جعفری

انوار احمدی پریس الہ آباد

۱۵ رجولائی سنہ ۴۲ء



کوثر چاند پوری سنہ ۱۹۴۶ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عروس کا شب نامچہ

گھر بجلی کی تیز روشنی سے جگمگا رہا تھا۔ مردانہ سے باجہ بجنے کی آوازیں آ رہی تھیں میں اپنے کمرے میں ایک نئی اور آراستہ مسہری پر سر جھکائے بیٹھی تھی میرا دل مرجھایا ہوا تھا جیسے پھول گرمیوں کی تیز دھوپ میں مرجھا جاتا ہے وہ بجلی کی تنویروں اور باجہ کی پرشور آوازوں کو قبول کرنے پر تیار نہ تھا میں سوچ رہی تھی اگر شادی حوادث کی فہرست میں شامل نہیں ہے تو اچانک شادی کو اس سے الگ نہیں کیا جا سکتا اور اسے یقیناً حادثہ ہی سمجھا جائے گا۔ کل تک کوئی تذکرہ تک نہ تھا صبح سے دفعتہً سرگرمی شروع ہو گئی اور اس وقت در و دیوار اس زلزلے سے متاثر تھے جو بیاہ کے نام سے میرے مستقبل کو ایک اٹھتی تپ و لرزہ سے روشناس کرنے والا تھا میری زندگی میں اس کے بعد کوئی سانحہ وقوع پذیر ہونے والا نہ تھا جو لوگ شادی کو کسی ہولناک تغیر کا ہم معنی خیال کرتے ہیں ان کے

نزدیک بھی یہ ہولناکی ایک ہی بار وقوع میں آتی ہے —— ہاں تو میں مسہری پر سر جھکائے بیٹھی تھی انگلیوں پر مہندی کی سرخی نمایاں تھی اور غالباً یہی ایک ظاہری علامت تھی جو میرے نحس جسم کو شادی کی مسرتوں میں شریک کر رہی تھی قریب ہی کچھ لونڈیاں بیٹھی تنکھیوں سے میرے ہاتھوں کو دیکھ دیکھ کہہ رہی تھیں، چاہتی تو مہندی کچا ہتی کو بیان!

میں سوچ رہی تھی یہ لونڈیاں جو کچھ کہہ رہی ہیں اس میں سچائی نام کو نہیں صرف ہاتھوں میں مہندی رچ جانے سے ہیں یہ باور نہیں کر سکتی کہ مجھے چاہا جاتا ہے نہ ہونے والے شوہر کی عمر کو دیکھتے ہوئے یہ یقین کیا جا سکتا ہے کہ آئندہ مجھے چاہا جائے گا اگر ماں باپ کو مجھ سے محبت ہوتی تو میرے لئے کسی خوبصورت، نوجوان اور تعلیم یافتہ شوہر کی تلاش ناممکن نہ تھی بالخصوص ایسی حالت میں جبکہ ان اوصاف کے اکثر امیدوار موجود تھے رہا محبت کا مستقبل تو وہ بالکل صاف تھا پچاس سال کے ایک دولت مند بوڑھے سے محبت کی اُمید بالکل ویسی ہی تھی جیسے گیندے کا پھول سونگھ کر گلاب کی خوشبو کی توقع رکھنا میں نہیں کہتی کہ بوڑھے آدمی کا سینہ محبت کے نور سے خالی ہوتا ہے یقیناً ایک بوڑھا اپنے اکلوتے بیٹے یا بیٹی سے بہت زیادہ پیار کر سکتا ہے اسکی مرجھائی ہوئی رگوں اور سوکھے ہوئے اعصاب میں اولاد کی محبت کیلئے کافی گنجائش ہوتی ہے —— یہ بات نہیں، محبت سے میرا مطلب کچھ اور ہی تھا یعنی اُس سے میرا مدعا تھا حسن اور جوانی کی طلب یا جوان اور حسین بیوی کی آرزو اور بیتاب

اور تڑپتی ہوئی آرزو ظاہر ہے کہ یہ طلب اور آرزو ایک ایسے آدمی کے دماغ میں پیدا ہی نہیں ہوسکتی جو بچاس کے قریب پہونچ گیا ہو یہ تو تندرست نوجوان اور جذبات سے سرشار انسان ہی کا حصّہ ہے ——— ہاں تو باجہ بج رہا تھا روشنی ہو رہی تھی اور لونڈیاں بار بار گئے جا رہی تھیں، جاہتی کو مہندی لگا ہتی کو بان!

معلوم نہیں وہ اور کیا کیا بک رہی تھیں مجھے ان کی بکواس سے کوئی دلچسپی نہ تھی بلکہ ان مصنوعی باتوں پر مجھے سخت الجھن ہو رہی تھی میری روح کانپ رہی تھی اس کیکپی سے میری زبان اور کانوں کو بیکار کر دیا تھا، اور بھی سب حواس سن ہوکر رہ گئے تھے میں تو صرف یہی سوچ رہی تھی باجہ کیوں بج رہا ہے روشنی کیوں ہو رہی ہے ان باتوں کی کوئی وجہ میری سمجھ میں نہ آتی تھی پچھلی برسات میں ہماری بیٹھک گر پڑی تھی اس وقت نہ باجہ بجایا گیا تھا اور نہ روشنی کی گئی تھی اور اس سے پہلے جب زلزلہ کے کچھ جھٹکے محسوس کئے گئے تھے گھر میں یہ خوشی نہ منائی گئی تھی چند سال قبل میرا چھوٹا بھائی دفعۃً مر گیا تھا اُس وقت بھی رونے پیٹنے کے علاوہ کوئی ایسا مظاہرہ نہ ہوا تھا جسے جشن مسرت سے تعبیر کیا جائے اور آج ——— عین اُس وقت جب میری روح کی کلیاں ٹوٹ رہی ہیں اور میں زندگی کے ناہموار راستہ پر چلتے چلتے ٹھوکر کھا کر گر پڑی ہوں یا کسی نے ڈھکیل کر مجھے گرا دیا ہے اور جب میں اپنے مستقبل میں زلزلہ کے متواتر جھٹکے محسوس کر رہی ہوں جب میرا دل موت کی گود میں ہچکیاں لے رہا ہے سیکڑوں، لاکھوں بلکہ کروڑوں

ننھی ننھی آرزوئیں، تمنائیں اور اُمیدیں، اس کے ساتھ گھٹ گھٹ کر دم توڑنے والی ہیں بالکل اُسی طرح جیسے گذشتہ ہفتہ میں میری ممانی پورے دن کے بچے کو پیٹ میں لیکر دوسرے عالم کو سدھار چکی تھیں —— باجہ کیوں بج رہا ہے اور روشنی کیوں ہو رہی ہے؟

سونے کے چھلے میری انگلیوں میں جگمگا رہے تھے پھر بھی ہیرے کے نگ کی ایک قیمتی انگوٹھی مجھے پہنائے جانے والی تھی میری مسہری کو عورتوں کے ہجوم نے گھیر لیا، بعض مسکرا رہی تھیں بعض لمبے لمبے سانس لے رہی تھیں اور سینہ کے ساتھ پلاؤ سے بھرے ہوئے پیٹ بھی ہلتے ہوئے معلوم ہو رہے تھے۔ کسی کے کالے اور چیچک کے داغوں سے ٹانکے ہوئے چہرے پر حیرت سی چھائی ہوئی تھی اور کوئی پان چبا چبا کر اباجان سے چھالیہ کی گرانی کا انتقام لے رہی تھی دادی اماں نے ٹھنڈے اور کانپتے ہوئے ہاتھوں نے میری کلمہ کی انگلی کو ٹٹول کر انگوٹھی پہنانے کی کوشش کی —— وہی ہیرے کے نگ کی قیمتی انگوٹھی جو میری جوانی، حسن بلکہ میری زندگی کا معاوضہ تھی پھر بھی قیمتی تھی اس پر ہیرے کا نگ جڑا ہوا تھا نا جس پر نہ معلوم کتنی جوانیاں اور زندگیاں نثار کی جا سکتی ہیں دادی اماں کے ہاتھ کانپ رہے تھے ہونٹوں سے کچھ الفاظ نکلتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے شاید وہ مجھے دعائیں دے رہی ہونگی لیکن کیا اس وقت کی دعائیں ان کی عمر بھر کی دعاؤں سے زیادہ موثر تھیں جو حادثہ ان کی ساری عمر کی دعاؤں سے نہ ٹل سکا وہ لمحہ بھر کی دعاؤں سے کیونکر ٹل سکیگا اور پھر دادی اماں تو مدت سے اندھی تھیں ان کی آنکھوں

میں پانی اتر آیا تھا کان بھی بہرے ہو گئے تھے وہ ڈھولک کی آواز بھی نہیں سن سکتی تھیں انھیں کیونکر خبر ہو سکتی ہے کہ باجہ کیوں بج رہا ہے اور روشنی کیوں ہو رہی ہے ——— بیٹی انگلی ڈھیلی کرو تمہارے دولھا نے بھیجی ہے یہ انگوٹھی ہمارے دولھا یعنی تمہارے دادا نے بھی ہمیں ایک انگوٹھی بھیجی تھی اور دیکھو اب تک اس انگوٹھی کو ہم پہنے ہوئے ہیں ہماری دادی نے یہ ہمیں پہنائی تھی ——— اللہ کرے بچی تیری کوکھ سدا ٹھنڈی رہے: تو دودھوں نہائے پوتوں پھلے!! ایک دم دو تین گرم گرم بوندیں میرے ہاتھ پر ٹپک پڑیں شاید وہ رو رہی تھیں، ان بوندوں سے روح کی بہت سی چنگاریاں بجھ گئیں مجھے ان سے بڑا سکون ملا مگر وہ کیوں رو رہی تھیں کیا ان کے دولھا جوان تھے ضرور ان کے میاں جوان ہوں گے اور میرا دولھا معلوم نہیں اسے دولھا ہی کیوں کہا جا رہا ہے وہ تو ایک بوڑھا آدمی ہے کیا دولھا بھی بوڑھا ہو سکتا ہے؟ ——— عورتیں یہ سمجھ رہی تھیں کہ دادی اماں کی بینے نور آنکھوں میں خوشی کے آنسو ہیں لیکن مجھے یقین تھا کہ وہ اندھی اور بہری ہو گئی ہیں باوجود میرے غم میں شرکت کر رہی ہیں وہ ہیرے کے نگ کی انگوٹھی کے بوجھ سے مجھے بچانا پسند نہ کرتی تھیں یوں تو لڑکیوں کے بیاہ میں ——— سب عورتیں ہی رویا کرتی ہیں انھیں ایسے موقعہ پر اپنے بیاہ کی باتیں یاد آجاتی ہیں میکہ کی سہانی فضا آنکھوں میں پھر جاتی ہے اور ساتھ کی چڑیوں کی طرح بابل کے گھر سے اپنے اڑ جانے کا منظر یاد آجاتا ہے پر دادی اماں کسی اور ہی وجہ سے رو رہی تھیں وہ اندھی اور بہری ضرور تھیں شاید ان کے آنسو میرے دل کی باتیں سن رہے تھے اور میری چھاتی میں انگارے

دہک رہے تھے انھیں بجھانا چاہتے تھے وہ ان چنگاریوں کو بھی دیکھ رہی تھیں جو میری روح میں چھپی ہوئی تھیں باجہ اور زور سے بجنے لگا کچھ نئی تانیں بھی کہیں سے آکر اسمیں مل گئیں کائنات گونج اٹھی میرا دل دہل گیا گھر میں ایک سیلاب سا آتا ہوا معلوم ہوا ــــ بارات آگئی تھی، رخصتی کی تیاریاں پہلے سے ہو رہی تھیں مجھے کپڑے تبدیل کرائے گئے اور وہ تمام رسمیں ادا کی گئیں جو واقعی کسی شادی ہی کیلئے موزوں ہو سکتی ہیں باجہ چیخ رہا تھا اسکی چیخیں دم بدم تیز اور بلند ہوتی جارہی تھیں باجہ والے گا رہے تھے،

بیٹی نہ دیجو بدیسی سن بابل میرے
ہم تو رے جھاڑوں کی چڑیاں
ڈلا مارنے اڑ جائیں
شام ہوئے اڑ جائیں
سن بابل میرے!!

وہ دیر تک یہی گیت الاپتے رہے بوڑھی جوان عورتیں اور کنواری لڑکیاں اس دلدوز گیت کو سن سن کر روتی رہیں، ان کے آنسو نئے کرتوں کی آستینوں میں یا دوپٹے کے پلوؤں میں جذب ہوتے رہے اور میرے آنسو دل کی آگ ہی کو نہ بجھا سکے ــــ میری طبیعت ان جھوٹے گانوں سے الجھنے لگی میں تو ایسے گانوں کی منتظر تھی جن میں جوان لڑکیوں کو بوڑھے شوہروں سے بیاہنے کی بری رسم پر کسی نے روح کی گہرائیوں سے چیخیں بلند کی ہوں ــــ خوشی کے موقعہ پر اور چیخیں ایسی چیخیں میری یادادی

اماں کی روح کے علاوہ اور کہاں سے بلند ہو سکتی تھیں مگر میں عروس
تھی جسکی کوئی چیخ کبھی سنی ہی نہیں جایا کرتی اور دادی اماں اندھی بھی
تھیں اور بہری بھی اور ــــ سب کی رائے میں ان کے آنسو غم کے نہ تھے
خوشی کے تھے، یعنی گھر بھر میں ــــ سب اندھے اور بہرے تھے وہ نہ کچھ
دیکھتے تھے نہ سنتے تھے۔ بہر حال میری یہ اُمید کہ اس گہری رسم پر کوئی
روح کی گہرائیوں سے چیخیں بلند کرے بالکل بے موقعہ تھی ــــ
یہ سارا جشن تو میری موت ہی کے موقعہ پر منایا جا رہا تھا صرف میں
تھی کہ اپنی بیکسی کی موت پر رو رہی تھی یا دادی اماں ہماری چیخیں
کسی کے کانوں تک نہ پہونچ سکیں اور ہمارے آنسو کسی کو دکھائی نہ دیئے
بارہ بجتے ہی باجوں نے پھر چیخنا شروع کیا میری رگیں اس دہکتے ہوئے
تنور کے پاس پہونچکر اینٹھنے لگیں جسمیں عنقریب مجھے ڈھکیلا جا رہا تھا
ــــ ابا جان کئی مرتبہ اندر آکر کہہ چکے تھے روٹیاں جلی جا رہی ہیں
تنور میں انگارے زیادہ ہو گئے ارے کوئی ان اندھوں سے جا کر کہہ تو
دے ذرا روٹیوں کی خبر لیں ــــ روٹی جل کر بد مزہ ہو جاتی ہے
اور بیٹی ؟ ــــ میرا دل خوب زور زور سے دھڑکنے لگا میں کیسے بُرا کہہ
رہی ہوں جس نے مجھے ساری عمر چاہا ــــ مگر میری دھڑکنوں سے
روح کے ان سیاہ دھبوں ــــ اور ان پھٹے ہوئے چھالوں
کا جواب نہ ہو سکتا تھا جو اس تنور میں جھونک دینے کے بعد لازمی طور
پر پیدا ہونے والے تھے، روٹی کی جلی ہوئی سطح کو نوچ کر پھینکا جا سکتا

تھا مگر روح کا کھرچ ڈالنا ممکن نہ تھا بھٹیاروں سے روٹی جلانے کا
شکوہ اور .... اور .... میرے اعصاب میں عجیب
قسم کا تشنج ہونے لگا وہ موئے آتش دیدہ کی طرح پیچ و تاب میں مبتلا
ہو گئے ــــــ باجہ پوری شدت سے چیخ رہا تھا ــــــ
عورتیں بوڑھی اور جوان عورتیں باجہ سے زیادہ بلند آواز میں بول رہی تھیں ان
کی آوازیں کانوں میں گونج رہی تھیں،

اللہ سب کو ایسی خوشیاں نصیب کرے۔

بڑی لڑکی ہی کے بھاگوں ایسے رشتے ملا کرتے ہیں

کیسی خوشیاں؟ ــــــ اور کیسے رشتے؟ یعنی باپ کے برابر
شوہر اور ایسے شوہر کے گھر جانے کی خوشیاں! ممکن ہے ایسے رشتے
لڑکی کے بھاگ ہی سے نصیب ہوتے ہوں مگر ان خوشیوں میں تو
اس غریب کا کوئی حصہ نہیں، اور جیسے تم جیسی اندھی اور بہری عورتیں
ــــــ دادی اماں سے بھی زیادہ اندھی اور بہری عورتیں خوشی
کہتی ہیں وہ تو اس بھاگوان لڑکی کے نزدیک سب سے بڑا سوگ ہے
کاش تم اس حقیقت کو سمجھ سکتیں اور کاش خوشی اور رنج کے ان احساسات
میں ان بھاگوان لڑکیوں کا نقطۂ نظر بھی شامل ہوا کرتا جنھیں تم خوش
نصیب کہتی اور سمجھتی ہو حالانکہ صحیح معنی میں وہ دنیا کی سب سے زیادہ بدنصیب
منحوس اور ستم رسیدہ لڑکیاں ہوتی ہیں کمرہ خوشبو سے مہک رہا تھا
میرے جسم سے بھی خوشبو کی لپٹیں نکل رہی تھیں اور ایسا ہونا بھی چاہیے

تھا بات یہ تھی کہ جو کچھ ہو رہا تھا جسم ہی کے لئے ہو رہا تھا روح سے
ان رشتوں کو کیا نسبت؟
پھر ایک ہنگامہ ہوا قیامت اُٹھی اور مجھے مرے ہوئے ایک گٹھر
کی طرح کسی نے گود میں لے کر مسہری سے اٹھایا اس وقت مجھے کوئی
چیز نظر نہ آ رہی تھی، جس طرح ساون بھادوں کی گھنگھور گھٹائیں سورج
کو چھپا لیتی ہیں اسی طرح آنسوؤں کے طوفان نے میری آنکھوں کو چھپا لیا
تھا وہ چھوٹی سی ناؤ کی طرح آنسوؤں کے جوار بھاٹے میں ڈوب کر
رہ گئی تھیں آنکھوں سے جتنا پانی برس رہا تھا اتنی ہی دل کی آگ بھڑک
رہی تھی، آنسو بہ رہے تھے منہ سے لپٹیں نکل رہی تھیں ہر سانس
ایک شعلہ بن جاتی تھی چلتے چلتے کسی نے میرے منہ میں پان ٹھونس
دیا ــــ بالکل اسی طرح جیسے شادی کی دوسری چیزیں
میرے دل و دماغ میں ٹھونسی جا رہی تھیں مگر منہ اور دل دماغ میں
تو کافی فرق ہے ــــ میرا جسم اچھلنے لگا ہلکے ہلکے جھٹکے محسوس
ہونے لگے روح اس قسم کے جھٹکے پہلے سے محسوس کر رہی تھی جسم کو
اب ان کا احساس ہوا کہار پینس اٹھا چکے تھے کبھی کبھی کندھا بدلتے
وقت خفیف جھٹکے لگتے تھے کہار مجھے اٹھائے لئے جا رہے تھے ان کے
منہ سے ترتیب کے ساتھ مختلف آوازیں نکل رہی تھیں وہ سمجھ رہے
تھے ایک عروس کو اٹھائے لئے جا رہے ہیں انعام کی توقعات نے
ان کی رفتار کو تیز کر دیا تھا انھیں خبر بھی نہ تھی کہ ان کے کندھوں پہ

ایک جنازہ ہے، عروس نہیں ہے ایک میت ہے حسن اور جوانی کی، گلا گھونٹ کر ماری ہوئی ایک دوشیزہ ہے جس کا سینہ اُمیدوں اور آرزوؤں کی ایک وسیع قبر ہے ——— وہ دوڑ رہے تھے اور ہانپ رہے تھے، ہانپ رہے تھے اور دوڑ رہے تھے میرے سانس کی رفتار سست ہوتی جا رہی تھی سڑک پر پہونچکر مجھے کچھ ہوش آیا اور کانوں میں بہت سی اندھی اور بہری عورتوں کی باریک باریک آوازیں گونجنے لگیں وہ سب مل کر گا رہی تھیں۔

بیٹی نہ دیجیو بدیس سن بابل میرے!

یعنی وہی جھوٹا گانا جسکی تانیں دل کی دھڑکنوں اور روح کی تھرتھراہٹ سے بالکل خالی تھیں، بس الفاظ ہی الفاظ تھے خشک اور بے معنی الفاظ، باجہ زور زور سے بج رہا تھا اور روشنی؟ ——— اب میں اندھیری سڑکوں سے گذر رہی تھی ——— کہار دوڑ رہے تھے میں لمحہ، لمحہ اپنی سسرال کے قریب ہوتی جا رہی تھی جیسے کوئی ستارہ آسمان سے ٹوٹ کر تیزی سے زمین کی طرف آیا کرتا ہے اور پھر نہ معلوم کہاں چلا جاتا ہے، دو چار دن کے بعد میری نسبت بھی کوئی یہ نہ سوچیگا میں کہاں چلی گئی؟ فینس ایک جھٹکہ کے ساتھ زمین پر رکھدی گئی ——— آسمان سے ٹوٹا ہوا ستارہ اپنی تاریک اور دائمی قبر کے کنارے پہونچگیا، قہقہوں کی ایک زبردست گونج نے میری روح پر ہتوڑے مارنے شروع کئے بھدے جسم کی ایک موٹی سی عورت نے جس کا گوشت ڈھلی ہوئی

روئی کی طرح نرم اور متحرک تھا ڈولی کا پردہ اٹھا کر مجھے جھنجوڑ ڈالا جیسے بھو کی بلا گوشت کے کسی چیتھڑے کو جھنجوڑ ڈالتی ہے غالباً وہ مجھے گود میں اٹھانے کی کوشش کر رہی تھی چند بار جھنجوڑنے کے بعد بولی —— تین اور آئیں تو دلہن اُٹھئے! —— اتنے بڑے مجمع میں یہ بھی ایک عورت میری ہم خیال تھی اگرچہ اس کی گفتگو میں طنز کے نشتر چھپے ہوئے تھے مجھے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے کوئی مرچوں بھرے بٹے سے نئی ٹانکی ہوئی سل پر میرے دل کو پیس رہا ہے اور ایک بار پھر یہ بھو کی شیرنی مجھے لپٹ گئی اس نے مجھے اٹھا تو لیا پر جھپاک کی مکروہ آواز کے ساتھ پھر نیچے ڈال دیا دیکھا بڑی بیگم آپ نے کیسی سبز قدم ہے ہمارے سرکار کی نئی بیگم!

بڑی بیگم اور نئی بیگم؟ —— میں نے سوچنا شروع کیا کون بڑی بیگم؟ میری سوت ضرور بڑی بیگم میرے شوہر کی پہلی بیوی ہے ورنہ پھر نئی بیگم کا کیا مطلب، مگر ماں بھی تو ہو سکتی ہے نہیں وہ ضرور میرے شوہر کی پہلی بیوی ہے میری روح میں ایک پھانس سی چبھ گئی اور اسکی کھٹک ہر لمحہ بڑھتی ہی گئی —— ٹن ٹن گھڑی نے دو بجائے اس آواز نے میرے خیالات کو اپنی طرف متوجہ کر لیا، گھڑی میرے سرہانے رکھی ٹک ٹک کر رہی تھی شاید اسکی یہ بے ربط آوازیں مجھ سے کچھ کہہ رہی تھیں واقعی گھڑی بول رہی تھی وہ کہہ رہی تھی میں مدتوں سے یہاں وقت گذار رہی ہوں اور اپنی آوازوں کو دن رات کی وادیوں میں تحلیل کر رہی

ہوں شکر ہے تم بھی آگئیں ——— میں بڑی بیگم ہوں اور تم نئی بیگم
ہیں صرف ٹھہر جایا ہی کرتی ہوں اور اپنا بیکار وقت کاٹتی رہتی ہوں میں
تمہارا کچھ نہ بگاڑوں گی میں تو خود تمہاری طرح مظلوم ہوں ———
گھڑی بول رہی ہے یا بڑی بیگم ہیں جو بک گئی اور آنکھیں پھاڑ کر
دیکھنے لگی یہاں گھڑی کے علاوہ اور کوئی نہ تھا وہ کہہ رہی تھی میری
ٹک ٹک اب دن آٹھ پہر تمہارے کانوں میں پہنچا کرے گی ———
تمہارے دولہا بڑی بیگم والی تمہاری سوت گھڑی کی طرح وقت
کاٹنے اور بے فائدہ ٹک ٹک کا شور مچانے والی بدقسمت عورت
اور تم نئی بیگم تم ——— نئی بیگم سن رہی ہو ٹک ٹک!
ٹک ٹک!! وہ کہتی گئی نئی بیگم کئی کئی بار بگڑی اور گھڑی ساز کے
یہاں سے درست ہو کر واپس آگئی مگر تمہارے دولہا کی دو بیویاں
ایسی بگڑیں کہ اُن کو گھڑی ساز نے اب تک سیدھا کر نہ بھیجا
شاید وہ سدھر ہی نہ سکیں یہ ہیں یہ بڑی بیگم تو وہ بدقسمتی سے نہ وقت
بتاتی ہیں نہ بگڑتی ہیں وہ بانجھ ہیں آخر شوہر کی جائداد کا وارث
بھی تو کسی کے پیٹ سے جنم لے تو اس کے لئے تم آگئیں نئی بیگم تم
——— سن رہی ہو نئی بیگم ؟ جب میں گھڑی کی طرف دیکھتی ٹک
ٹک کی مہین آوازوں کے سوا کوئی بات سمجھ میں نہ آتی ؛
گھنٹے گھنٹ ——— گھڑ گھڑ کوئی جوتوں سمیت فرش پر چل
رہا تھا میں نے گھڑی کی ٹک ٹک پر کان لگا دیئے جواب دل

کی دھڑکنوں میں ڈوبتی جا رہی تھی کمرے میں کون داخل ہوا؟ —
میں نے گھڑی سے پوچھا وہ گونگی ہو گئی کچھ نہ بتا سکی کمرے تو وہی تھے جنھیں اپنی
جائداد کے لیے ایک وارث کی تلاش تھی کیا شادی صرف اس
وارث کی تلاش کے شوق ہی میں کی گئی ہے؟ دل کی دھڑکنوں کا
اس سے کوئی تعلق نہیں ایک بوڑھے شوہر کے جذبات کی گرد میں
قطعاً اس گناہ کا باعث نہیں؟ میرے رنگین ریشمی ڈوپٹے میں [illegible]
نے سیکڑوں دریچے بنا دیئے تھے میرا ماحول نہایت روشن تھا
روح کے سب دریچے بند ہو گئے تھے اس لیے دل میں اندھیرا
ہی اندھیرا تھا اس وقت میرے دل میں آنے والا کوئی نہ تھا
جب ہی تو میں سوچ رہی تھی کمرے میں کون آیا؟ ایک موٹا گہرے
سیاہ رنگ کا آدمی جس کی توند شیروانی کے بٹن کھولتے ہی روئی
کی گانٹھ کی طرح پھول گئی تھی کمرے میں ٹہل رہا تھا اور ٹہلتے ٹہلتے
میز کے پاس آ گیا تھا اور مجھے غور سے دیکھ رہا تھا — ارے
یہ تو بھینگا ہے توبہ توبہ اس کی پتلیاں کہاں غائب ہو گئیں سارا
دیدہ سفید ہو گیا — وہ دیکھ تو رہا تھا میری طرف —
غلط بالکل غلط اب مجھے یوں کہنا پڑے گا وہ دیکھ تو رہے تھے میری
طرف اور میں سمجھ رہی تھی آئینہ دیکھ رہے ہیں یا اللہ ان کی آنکھیں
اور پتلیاں! — انھوں نے میری طرف دیکھتے دیکھتے اپنے
دونوں ہاتھ اوپر اٹھائے اور منہ میں انگلیاں ڈال کر دو بڑی بڑی

لال رنگ کی بوٹیاں اگل دیں پھر اُنھیں گلاس میں ڈال دیا، کانچ کے شفاف گلاس میں جس میں پانی بھرا ہوا تھا، گلاس ہلکے سرخ رنگ میں بدل گیا وہ بوٹیاں گلاس میں پڑی ہنس رہی تھیں اب میں سمجھی یہ ان کے مصنوعی دانت تھے میں نے سنا تو تھا مصنوعی دانت بھی لوگ لگاتے ہیں آج تک اس قسم کے دانت دیکھے نہ تھے، ابا جان کے تو اللہ رکھے سارے دانت موجود تھے رہیں دادی اماں تو انھوں نے دانت بنوانے کا خیال ہی نہیں کیا میری آنکھیں اب ان دانتوں پر ہی جم کر رہ گئیں جتنا وہ ہنسنے کی کوشش کرتے اتنا ہی میں روتی روتے روتے میرے آنسو خشک ہو گئے، میں ان سے نفرت سی کر رہی تھی مجھے ان دانتوں سے گھن آرہی تھی، گلاس میں پڑے ہوئے مصنوعی دانتوں سے اور اگر یہ اُن کے منہ میں ہوتے؟

—— میں سر سے پیر تک کانپ گئی میری روح نے ایک پھریری لی اور پھر وہ جم کر رہ گئی میں دل ہی دل میں ان سے ڈر رہی تھی ،

—— ایک دم ابا جان کے بولنے کی آواز آئی وہ کہہ رہے تھے روٹیاں جلی جارہی ہیں تنور میں انگارے زیادہ ہو گئے ارے کوئی ان اندھوں سے جا کر کہہ تو دے ذرا روٹیوں کی خبر لیں!

لمبے لمبے سانس میرے رنگین ریشمی ڈوپٹے سے ٹکرائے اور اس میں سما کر رہ گئے جیسے جنگل کے بگولے بانسوں کے اونچے اونچے کانٹوں دار پیڑوں میں سما جاتے ہیں، لونگ، الائچی، پان، تمباکو

حقہ، بیڑی اور سگریٹ کسی نے ان سب چیزوں کو ملا کر میری ناک میں بھر دیا، رات بھر فوں!! ——— فوں!! فش فش!! کی آوازیں کمرے میں گونجتی رہیں جیسے میری بیٹی سے کسی نے ہانسی حصار سے لاکر کوئی بڑی سی بھینس باندھ دی ہو اور رات کے سناٹے میں وہ نہایت اطمینان سے جگالی کرنے میں مصروف ہو ———

گڑی کی ٹک ٹک بھی ان بھنکاروں میں دب کر رہ گئی وہ مجھ سے اور کچھ نہ کہہ سکی، دور بہت دور عورتیں اب بھی گائے جا رہی تھیں، بیٹی نہ دیجو.........

اور ابا جان بھی برابر چیخ رہے تھے روٹیاں جلی جا رہی ہیں، صبح تک یہی تانیں اور یہی چیخیں کانوں میں آتی رہیں اور بیٹی سے بندھی ہوئی بھینس برابر ہانپتی رہی،

بیگم کا شب نامچہ

آج دوپہر ہی سے سنیما کے لئے تیار ہو رہی تھی "صاحب" نے ڈرائیور کو پابند کر دیا تھا کہ ٹھیک ۹ بجے موٹر لے آئے ڈرائیور یہی چاہتا تھا کہ مجھے سنیما تک لے جانے کا اسے موقعہ ملے چند بار وہ مجھ سے کہہ چکا تھا بیگم آپ کبھی فلم نہیں دیکھتیں کیا آپ کو سنیما سے کچھ دلچسپی نہیں، میں اُنے ہمیشہ اُسے یہ کہکر ٹال دیا تھا دلچسپی کیوں

نہیں ایسی کون سی بے حس عورت ہوگی دنیا میں جو فلموں سے شوق نہ رکھتی ہو مگر سینما دیکھوں کس کے ساتھ؟

صاحب کیساتھ اپنے! اس نے موٹر چلاتے پیچھے مڑ کر کہا وہ مجھے بار بار سے گھور رہا تھا اور اسکی آنکھوں میں کوئی معصوم شرارت ناچ رہی تھی۔

صاحب ہمارے ساتھ فلم دیکھنا کب پسند کرتے ہیں انھوں نے تو اپنی دلچسپیوں کا حلقہ گھر کے باہر بنایا ہے۔

گھر کے باہر اس نے تعجب سے پوچھا بیگم جس کا گھر خود دلچسپیوں کا ایک حلقہ بلکہ جال ہو اُسے باہر نگاہ ڈالنے کی کیا ضرورت ہے صاحب کو اپنی بیگمات کیساتھ وہی لطف آسکتا ہے جس کی آنکھیں باہر تلاش رہا کرتی ہے،

میں خاموش ہو گئی، گھر قریب آگیا تھا پھر اس عنوان پر زیادہ گفتگو مجھے پسند بھی نہ تھی اپنے زخموں کو رات کی تاریکیوں میں آپ ہی کھرچ دیا کرتی تھی اور آنسوؤں سے انھیں دھو کر خاموش ہو جایا کرتی تھی، ضرورت نہ تھی کہ یہ کام کسی اور کے سپرد کیا جاسکے لیکن ڈرائیور برابر اپنی ہمدردی اور غمگساری کا ثبوت دیتا رہا یہ ڈرائیور نیا نیا ہمارے یہاں نوکر ہوا تھا کئی بار مجھے بازار اور پارک لے جا چکا تھا اور ہر مرتبہ اس نے صاحب کے متعلق کوئی نہ کوئی ایسی بات بیان کی تھی جس سے ان کی سنگدلی اور میری مظلومیت

کا اظہار ہو رہا تھا، وہ آہستہ آہستہ مجھے یقین دلا رہا تھا کہ میری حیثیت ایک نظربند کی سی ہے ساری سہولتیں مجھے حاصل ہیں لیکن آزادی میسر نہیں انھوں نے مجھے قید کر رکھا ہے اور وہ مجھے کوئی ایسا حق دینے کو تیار نہیں جو ایک نوجوان اور خوبصورت عورت کو لازمی طور پر ملنا چاہیے وہ گھر کے باہر شباب و رعنائی کے ناچتے ہوئے بگولوں کا خیر مقدم کر کے میری توہین کرتے ہیں ڈرائیور کی یہ سب باتیں بالکل سچی تھیں میں پہلے سے انھیں محسوس کر رہی تھی اب یہ احساس شدید ہوتے ہوتے انتقام کی حد تک پہونچ گیا تھا، اور میں کبھی کبھی یہ سوچنے لگی تھی صاحب سے انتقام کیونکر لیا جا سکتا ہے، کیا ڈرائیور اس سلسلہ میں میری کوئی مدد کر سکتا ہے وہ نوجوان بھی تھا اور حسین بھی، تندرست بھی تھا اور بذلہ سنج بھی، غلامی اور آقائی کے مراتب سے وہ قطعاً متاثر نہ تھا اپنے فرائض صحیح طور پر ادا کرتا اور نہایت آزاد، مطمئن اور فارغ البالی کی زندگی بسر کرتا، خوش لباس اتنا تھا کہ صاحب اور وہ دونوں اگلی سیٹ پر بیٹھ جاتے تو یہ معلوم کرنا مشکل ہو جاتا کہ ڈرائیور کون ہے اور صاحب کون ہیں۔ وجہ تھی کہ صاحب زیادہ تر پچھلی سیٹ پر ہی بیٹھا کرتے تھے آگے بیٹھتے تو ڈرائیور کو پیچھے بٹھا دیتے جب ڈرائیور مجھ سے کوئی گفتگو کرتا میں اس کے چہرے کی پوری صباحت کے مختلف رنگوں اور اس کے خوبصورت پیچ و خم میں گم ہو جایا کرتی، جیسے محبت کی حسین پگڈنڈیوں پر چلتے چلتے کوئی معصوم مسافر بھٹک کر راستہ بھول جاتا ہے، میں بھی بھٹکتی جا رہی تھی اور ایسا ہونا تعجب خیز بھی نہ تھا مجھے شباب کی خطرناک ولولہ نے تنہا چھوڑ

دیا گیا تھا کوئی راستہ بتانے والا بھی نہ تھا ایسی صورت میں میرا دامن کسی جھاڑی میں الجھ جاتا تو کوئی حیرت کی بات نہ تھی، ڈرائیور رفتہ رفتہ بے تکلف ہوتا گیا، اسکی طبیعت میں ذرا بھی جھجک پیدا ہوتی تو میری سانس دل میں گھٹنے لگتی جیسے بند کمرے میں دھواں گھٹ جاتا ہے اسی بے تکلفی کا نتیجہ تھا کہ آج میں اُس کے ساتھ جانے پر بہت خوش تھی، رات کی تاریکی جس قدر بڑھتی جاتی تھی میرے دل میں اتنی ہی روشنی ہوتی جارہی تھی، میں دیکھ رہی تھی بہت دور کسی جگہ چاندنی چھٹکی ہوئی ہے اور اس کی خاموش خوبصورتی مجھے بلا رہی ہے، میں تنہا وہاں کیونکر پہنچ سکتی تھی، صاحب ایسی رومانی میں بھگائے لے جانے کے عادی نہ تھے، ڈرائیور ہی لیجا سکتا تھا، تو مجھے ہی اُس نے موٹر دروازہ پر لگا دی اور ایک عمدہ نیلگوں سرج کی شیروانی پہنکر ڈیوڑھی میں کرسی پر آ بیٹھا کل اُس نے میرے گلے میں نکلس دیکھکر کہا تھا بیگم صاحبہ آپ کے گلے میں یہ نکلس اتنا سجتا ہے کہ میں نے اور کسی کی گردن میں اتنا سجتے نہیں دیکھا، سانس کی حرکتوں کیساتھ اس کا متحرک ہونا کیسا حسین منظر پیش کرتا ہے، وہ بولنے میں بڑی مہارت رکھتا تھا غالباً وہ کافی پڑھا لکھا آدمی تھا ایک سمجھدار آدمی کی تعریف کو اہمیت دینا میرا فرض تھا خصوصاً ایسی تعریف کو جو پہلی مرتبہ کیگئی تھی ایسی بات آج تک میں نے کسی کے منہ سے نہ سنی تھی مجھے یہ سنکر اتنی خوشی ہوئی کہ اپنے کمرے میں پہونچکر دیر تک میں مسکراتی رہی میرا دل اچھلتا رہا اور رخساروں پر سُرخی چھائی رہی جیسے میں نے کوئی نشیلی چیز پی لی ہو، میں سمجھتی ہوں اس پر عجیب قسم کا خمار

چھپاتا جارہا تھا میں نے اچھی طرح سمجھ لیا ایک جوان عورت کی خوشی ہی قسم کی باتوں سے وابستہ ہے وہ ایسی گونگی اور بہری دولت کو پسند نہیں کرتی جو اس کے حسن کی داد کبھی نہ دے اور ایسی ذمہ داریاں عائد کردے جن میں جوانی کی امنگیں دب جائیں، ہمارے صاحب بہت سمجھدار آدمی تھے مگر انہیں اتنی فرصت ہی کہاں تھی کہ وہ میرے نکلس کی ان حسین جنبشوں پر غور کرتے جن پر ڈرائیور نے بڑی دانشمندی کیساتھ تنقید بیٹھی اور مخمور کردینے والی تنقید کی تھی صاحب اپنی بیگمات کی ویران جوانیوں میں ان خصوصیات کو کبھی ڈھونڈتے ہی نہ تھے ان کے خیال میں یہ صرف بازار ہی کیلئے مخصوص تھیں، انھوں نے وحشی پرندوں کے مقابلہ میں پالتو چڑیوں کو کبھی کوئی اہمیت ہی نہ دی تھی وہ چمن کی آزاد تتلیوں کو گرفتار کرنے کی فکر میں منہمک رہا کرتے تھے، وہ ہر وقت حسن کے ہجوم اور طوفان میں گھرے رہا کرتے تھے پھر کس وقت وہ میرے یا بڑی بیگم کے حسن پر تبصرہ کرتے اور نکلس کی دھڑکنوں کو دیکھتے یا سنتے ——

میں نے وہی نکلس پہنا کچھ اور قیمتی اور خوشنما زیورات بھی پہن لئے جو عرصہ سے بکس میں بند تھے، زیورات آرائش کیلئے پہنے جاتے ہیں اور آرائش کا جذبہ پیدا ہوتا ہے کسی حوصلہ افزائی سے، کوئی دل بڑھانے والا نہ ہو تو آرائش وزیبائش سے فائدہ؟ —— لیکن آج آرائش کا جذبہ دل میں پیدا ہو گیا تھا میں حسین بننے کی خواہش کر رہی تھی، اور عہد شباب کے جو خوبصورت لمحات ضائع ہو چکے تھے ان پر مجھے سخت افسوس تھا یہ

آرزو اب سے چند ماہ قبل کیوں پیدا نہ ہوئی کاش میں چھ مہینے پہلے اپنے
حسن کی نمائش کرتی، آہ اب یہ چھ مہینے کہاں سے لاؤں، انھیں کہاں
ڈھونڈوں یہ تو میرے آنسوؤں کیساتھ پگھل کر بہ گئے، انھیں تو میری گرم
گرم آہوں نے دھواں بناکر رات کی تاریکیوں میں ملا دیا، میں کوشش کر رہی
تھی کہ زیادہ سے زیادہ حسین نظر آسکوں، غازوں کی جو شیشیاں میز پر رکھی
دھول میں اٹ رہی تھیں وہ سب مجھے یاد آگئیں میں نے انھیں ناک سے
لگا لگا کر سونگھا، جس غازے کو سونگھتی اسکی خوشبو پسند آجاتی یہ فیصلہ
کرنا مشکل ہوگیا کہ اس وقت مجھے کونسا غازہ استعمال کرنا چاہیئے بڑی مشکل
سے ایک قیمتی غازہ کی شیشی کو اٹھاکر سنگار میز پہ جا بیٹھی، بال درست
کئے، چہرہ پر غازہ لگایا، اب ہونٹ بھی مجھ سے سرخی طلب کر رہے تھے
میں نے ان کی دلفریب سرخی ضایع بھی تو کردی تھی مصنوعی سرخی موجود
تھی میں نے بڑی آسانی سے انھیں "لالہ گوں" بنا دیا، مہندی کا تو اب
رواج ہی اٹھ گیا اسکی جگہ ناخونوں کیلئے بھی ایسی چیزیں ایجاد ہوچکی ہیں
جو انھیں جوانی اور حسن کا ساتھ دینے کی قابل بنا دیتی ہیں، انھیں چیزوں
میں کی ایک چیز میرے بے رنگ ناخونوں پر بھی خون بنکر جھلکنے لگی میرے
پہننے کو کپڑے تو وہ نکالے گئے تھے جو شادی کے بعد میں نے کبھی پہنے ہی
نہ تھے، آئینہ دیکھکر جب کرسی سے اُٹھی تو میری آنکھوں سے جوانی ابلی
پڑتی تھی اور حسن تو رگ رگ سے پھوٹا پڑتا تھا ایک بوڑھی ملازمہ نے دیکھا
اور چپکے سے دوسری نوکرانی سے کہا، کہاں جا رہی ہیں بیگم صاحبہ؟ ——

ہم نے توکبھی انھیں ایسا سنگار کرتے نہیں دیکھا، یہ وہی بدزبان ملازمہ تھی جو بڑی بیگم پر ہمیشہ یہ آوازہ کستی رہتی تھی کہ وہ روزانہ رنڈیوں کی طرح سنگار کرکے سینما جاتی ہیں، ——— سینما جاتی ہیں یا خدا جانے کہاں جاتی ہیں دیکھتا کون ہے ملا نا تھ کے اس بیل کو! ——— اپنی بے زبان نوکرانی سے اسے کانا پھوسی کرتے دیکھکر میں سمجھ گئی کہ یہی آوازہ مجھ پر کسا جائیگا، دیکھنا یہ ہے کہ اس میں صداقت کتنی ہے ٹھیک ساڑھے ۹ بجے میں ایک قیامت خاموش یا حشر گویا بنکر گھر سے نکلی، ڈرائیور سگریٹ پی رہا تھا لہردار جے پوری صافہ اسکے سر پر بندھا ہوا تھا جو بڑے کالر کی کسی ہوئی گرم شیروانی اس کے سڈول جسم کو نمایاں کر رہی تھی، اس نے نگاہیں اٹھاکر سر سے پیر تک مجھے دیکھا اور بدستور کرسی پر بیٹھا مسکراتا رہا گویا وہ میرا ملازم نہیں آقا ہے، سگریٹ داہنے ہاتھ کی انگلیوں میں دبا ہوا آہستہ آہستہ سلگتا رہا، اسکی نگاہیں جن میں چنگاریاں سی لپٹی ہوئی تھیں میرے سراپا کا جائزہ لیتی رہیں جس مقام پر نگاہیں ٹھہرتیں یہ معلوم ہوتا کسی نے زور سے نشتر چبھو دیا میں چونک جاتی مجھے بھی اتنا ہوش نہ تھا کہ اس سے پوچھتی بیٹھے کیوں ہو کیا چلوگے نہیں، اس کے بیٹھے رہنے کا شاہانہ انداز اور اسکی یہ حاکمانہ بے نیازی مجھے بہت پسند آئی، اور میرے جذبات اسکے سامنے جھک گئے واقعی وہ حاکم اور بادشاہ تھا، ——— دل جسے بادشاہ تسلیم کرلے وہی بادشاہ ہے ——— بہت دیر کے بعد

نہایت اطمینان کیساتھ وہ مسکراتا ہوا کھڑا ہو گیا، اس نے مجھے سلام نہیں کیا لیکن اس مسکراہٹ میں وہ لطف آیا جو کسی کے سلام میں کبھی نہ آیا تھا، اس نے دوڑ کر موٹر کی کھڑکی کھول دی میں ساری سنبھالتی ہوئی پچھلی سیٹ پر جا بیٹھی، اس نے موٹر چلانی شروع کر دی، تھوڑی دور چلنے کے بعد وہ بولا بیگم صاحبہ سینما گھر تو یہ آ گیا اور کہانی کے مکالمے ابھی لکھے ہی نہیں گئے، کوئی ہرج نہ ہو تو تھوڑی دور چکر لگا دوں آپ کو ابھی دوسرا شو شروع ہونے میں کافی دیر ہے یہ چاندنی نکھری ہوئی شفاف چاندنی ایک احساس سو گواری کیساتھ آپ کو دیکھ رہی ہے۔

ایسا نہ ہو کہ شو شروع ہو جائے!

اگر ہو بھی جائے تو کوئی ہرج نہیں وہاں کبھی بھی باتیں ہوتی ہیں

اس نے نہایت دلیری سے کہا وہ چند روز ہی میں نہایت بے تکلف اور دلیر ہو گیا تھا وہ اپنے مزاج کے اعتبار ہی سے آزاد اور بیباک تھا ہمارے یہاں کی نوکری کو اس نے کبھی زیادہ اہمیت نہ دی تھی وہ کہا کرتا کہ چالیس پچاس کی نوکری تو مجھے ہر جگہ مل سکتی ہے۔ صاحب بھی اس کا بہت خیال کرتے تھے اس کے ساتھ انھوں نے دوسرے ملازموں کا سا سلوک کبھی نہیں کیا، میرا کوئی ہرج نہیں میں تو چاندنی کو ہمیشہ سے پسند کرتی ہوں، گویا اس نے زبردستی مجھے یہ جملہ کہنے پر مجبور کر لیا،

پسند کرتی ہیں آپ چاندنی کو اور رہتی ہیں اندھیرے گھر میں، اس
نے موٹر کو گھماتے ہوئے کہا آپ پیچھے بیٹھی ہیں اگر آپ موٹر چلا سکیں
تو آپ کی جگہ میں آجاؤں؟ بات یہ ہے کہ اگلی سیٹ میں جو رومانیت
ہے وہ پچھلی سیٹ میں نہیں،

موٹر تو میں نہیں چلا سکتی لیکن تمہارے پاس بیٹھنے میں مجھے کوئی
تامل نہیں، میں نے اس کی آنکھوں سے مرعوب ہو کر کہا، غالباً وہ آدمی
کو مسخر کرنے اور دوسرے آدمی کے شعور کو بیکار کر کے اسکے لاشعور سے کام
لینے کا فن جانتا تھا میں اس کے اشاروں پر ناچ رہی تھی اور وہ ایک مطلق العنان
حاکم کی طرح مجھے حکم دے رہا تھا، دور تک ہم چاندنی کی رومانی تنویروں
میں بہتے ہوئے چلے گئے، موٹر آزادی سے سڑک پر دوڑ رہی تھی اور خواب
کو دھول میں دباتی جا رہی تھی یہی دھول میری آنکھوں اور نتائج کے
درمیان حائل تھی، کبھی کبھی کوئی چھوٹا سا پرند راستہ کاٹ کر ادھر
سے ادھر چلا جاتا اور دل دھک سے ہو جاتا چاندنی اپنی ٹھنڈک سے
فضا کو مخمور بنا رہی تھی، پیڑ آنکھیں بند کئے ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکوں سے
جھوم رہے تھے کبھی وہ سوتے ہوئے معلوم ہوتے کبھی ہوا کی جنبش انھیں
جگا دیتی، بعض اوقات سارس کی آوازیں محبت کے جاگتے ہوئے
نغموں کو لے کر کانوں میں داخل ہوتیں اور روح پر چھا جاتیں اور ایسا
معلوم ہوتا سارس اپنی سچی محبت کے پیام بھیج رہے ہیں، سارس
کبھی اپنے جوڑے سے بچھڑنا پسند نہیں کرتا مگر اس کی محبت یک طرفہ

نہیں ہوتی، میں اپنے جوڑے سے بچھڑتی جارہی تھی پھر بھی یہ پہلی ہی
اوڑان تھی میری کوشش سے یہ حادثہ کیونکر رکتا، صاحب میں سارس
کی سی وفاداری نہیں تھی انھوں نے کبھی میری روح کو سچی محبت کا کوئی
پیام نہیں دیا تھا وہ خود مجھے اپنی آغوش سے الگ رکھنا چاہتے تھے
ان کے جذبات نے کبھی میری جوانی کی قدر نہیں کی تھی اگر آج میں محبت
کی آزاد فضا میں پرواز کر رہی تھی ——— چاہے وہ فضا چاندنی کے
باوجود کتنی ہی دھندلی، یا تاریک کیوں نہ ہو ——— اس میں اڑنا
مجھے صاحب ہی نے سکھایا تھا، مجھے مدت سے ان کے پروں کی
آوازیں آرہی تھیں اور یہ صدائے پرواز مخفی طور پر مجھے اڑنا سکھا
رہی تھی، میرے جذبات کے جاڑوں میں کلیاں پھوٹ رہی تھیں ننھی
اور نازک کلیاں، صاحب چاہتے تو پر بننے سے پہلے ہی انھیں نوچ
کر پھینک سکتے تھے، مگر وہ چاہتے ہی کیوں انھوں نے اپنی دانست
میں راز کا برقعہ اوڑھ رکھا تھا وہ سمجھتے تھے ان کے پروں کی سرسراہٹ
کوئی نہیں سن سکتا، میں بھی نہیں سن سکتی میری روح بھی نہیں سن
سکتی، انھیں کیا خبر تھی کہ میری روح سن ہی نہیں سکتی دیکھ بھی سکتی ہے
——— اور اصل بات تو یہ ہے کہ میں نے محبت کو دعوت نہ دی تھی
محبت خود مجھے کھینچ لائی تھی، روحانی فضاؤں کو میں نے نہیں بلایا تھا
وہی مجھے پکار رہی تھیں، اور جب میں ان کی گود میں آرہی تو میری سوتی
ہوئی رگیں جاگ اٹھیں جیسے رباب کے تاروں کو کوئی چھیڑ دیتا ہے اور

وہ کانپنے لگتے ہیں، اعصاب میں حسن وعشق کا جو دیوتا عمر بھر سے سو رہا تھا وہ بھی کروٹ لے کر اُٹھ بیٹھا، منجمد جذبات ایک نامعلوم اور لطیف گرمی سے پگھل گئے۔ موٹر دور نکل گئی اور اسکی رفتار برابر تیز ہوتی رہی اگرچہ میں خوب سمجھ رہی تھی کہ ہم سینما سے دور ہوتے جارہے ہیں، وقت گزرتا جارہا ہے بلکہ گذر چکا ہے لیکن اس سفر کی دلچسپیوں نے فلم دیکھنے کے شوق کو دبا دیا تھا اور یہی نہ چاہتا تھا کہ واپسی ہو، میں دل ہی دل میں سوچ رہی تھی کاش موٹر یوں ہی چلتی رہے رات بھر نہیں عمر بھر موٹر یوں ہی دوڑتی رہے اور ڈرائیور کبھی کبھی کنکھیوں سے اسی طرح مجھے دیکھتا رہے میں اس کے لباس کی بھینی بھینی بو سونگھتی رہوں میں نے انجان بن کر پوچھا کیا سینما ہاؤس آج بہت دور چلا گیا ہے آپ کہاں جارہے ہیں؟

جی ہاں آج فلم شہر سے ذرا فاصلے پر دکھائی جائے گی اور میں وہاں جارہا ہوں جہاں فلمیں بنائی جاتی ہیں میں فلم دیکھنے کے لئے سفر نہیں کررہا بلکہ بنانے کے لئے کر رہا ہوں،

کیا آپ کوئی فلم تیار کریں گے؟

تیار نہیں کروں گا تیار کر رہا ہوں اس کا آغاز اُسی وقت سے ہو چکا ہے جس وقت ہم گھر سے روانہ ہوئے تھے اس نے یہ کہتے کہتے میری طرف دیکھا اور میری آنکھوں میں جذبات کی روشنی دیکھکر اس نے بریک دبا دیا موٹر ایک آواز کے ساتھ ٹھہر گئی انجن تھرتھرا تا رہا، فضا کانپتی

رہی اور چاندنی مسکراتی رہی، ڈرائیور نے میری ساری کا ایک کونہ ہاتھ میں لے کر دیکھا پھر اُسے سونگھا اور ماتھے سے لگایا ——— یہ کیا ؟ ——— میں نے مسکرا کر پوچھا

پیشانی میں دیر سے کچھ آرزوئیں تڑپ رہی تھیں شاید اس عمل سے کچھ سکون ہو جائے،

آرزوئیں دل میں تڑپا کرتی ہیں یا پیشانی میں؟ میں نے تعجب کے ساتھ سوال کیا

بیگم صاحبہ آدمی اور اُس کا دل زندہ ہو تو جسم کے ہر حصہ میں آرزوئیں تڑپ سکتی ہیں، آرزو کا کوئی مقام نہیں، محبت انسان کے سارے بدن کو آرزوؤں میں بدل دیتی ہے

کیسی محبت؟ میں نے پوچھا۔

بیگم صاحبہ یہ نہ پوچھئے کیسی محبت ورنہ مجھے کہنا پڑے گا کہ جیسی محبت مجھے آپ سے ہے

میں نے غور سے ڈرائیور کو دیکھا اسکی آنکھوں میں آنسو جھلک رہے تھے وہ رو رہا تھا آنسوؤں کی بوندیں آہستہ آہستہ اس کے رخساروں پر پھسلتی ہوئی تیزی سے نیچے کو آ رہی تھیں ———

تم رونے لگے ڈرائیور صاحب؟

آج رونے لگا بیگم صاحبہ میں تو کئی مہینے سے رو رہا ہوں، لگاتار رو رہا ہوں میری آنکھیں اس عرصہ میں کبھی خشک ہی نہیں ہوئیں،

کیوں لیا؟

اس کا جواب ابھی میں نہ دوں گا، ——— ڈرائیور نے بات کاٹ کر میری تعریف شروع کردی، اس نے آنکھوں اور پلکوں سے لیکر میرے پیروں تک کی تعریف کی پھر کپڑوں کے متعلق اس نے کہنا شروع کیا، زیورات کے متعلق کہا، ایسا محسوس ہوا کہ اس نے رفتہ رفتہ میرے دل کو کسی ایسے جال میں پھانس لیا جس سے نکلنے کی خود اُسے کوئی تمنا نہ تھی اس نے بایاں ہاتھ میری گردن میں ڈال دیا اسکی کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی کی باریک آوازیں میرے سینہ میں بلکہ روح میں گونج رہی تھیں ——— یہ کیا؟ میں نے پھر دبی ہوئی آواز میں کہا،

آپ کو مجھ سے اس قسم کے سوالات کرنے کا حق نہیں بیگم صاحبہ میں وہی کرتا ہوں جو آپ کے صاحب روزانہ کیا کرتے ہیں یہ سبق مجھے انھیں سے ملا ہے،

وہ کیا کیا کرتے ہیں؟

یہی جو میں کر رہا ہوں،

کیونکر کرتے ہیں وہ؟

روزانہ وہ سینما دیکھنے آتے ہیں اور یہی سڑک اُنھیں نئی نئی فلمیں دکھاتی ہے رومانی اور رو عجیب فلمیں، ——— بولتی ہوئی متحرک تصویریں!

میں اس گستاخی کو برداشت نہ کر سکونگی ——— میں نے اپنے دل پر جبر کرتے کہا۔

بیگم صاحبہ اس سڑک پر اور اس موٹر میں بڑی بڑی گستاخیاں کی گئی ہیں اور خوش قسمتی سے سب برداشت کر لی گئی ہیں۔

تمہارا ارادہ کیا ہے آخر؟

میرا ارادہ؟ اس نے غور سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا، وہ کچھ دیر خاموش رہا پھر سینہ پر ہاتھ رکھکر بولا بیگم صاحبہ میرا ارادہ؟ اس کا چہرہ متغیر ہو گیا آنکھیں اوپر کو چڑھتی ہوئی معلوم ہونے لگیں ——— موٹر پھر چلنے لگی اب ہم کئی میل دوڑنے کے بعد آہستہ آہستہ گھر کی طرف واپس آ رہے تھے چاندنی چھٹکی ہوئی تھی مگر اسکی تنویروں میں مسکراہٹ نہ تھی چاند کی پیشانی پر آنسو جھلک رہے تھے پیڑ خاموش تھے ان پر ایک الم انگیز سکوت طاری تھا سارس بول رہے تھے مگر ان کی آوازوں کے نغموں میں زیر و بم کے سوا کچھ نہ تھا، وہ ہر قسم کے پیغام سے خالی تھیں انھوں نے میری روح سے کوئی بات نہیں کی، ایک بجتے بجتے موٹر دروازے پر رکی صاحب ابھی تک غائب تھے ڈرائیور نے جلدی سے کھڑکی کھولی اور میں نے مصنوعی غصہ کے جذبات چہرہ پر نمایاں کر کے کڑی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا اس نے ایک افسردہ مسکراہٹ سے اس کا جواب دیا۔ اور میں آج کی قلم پر تنقید کرتی ہوئی اندر چلی گئی جاتے

ہی مسہری پر گر پڑی، جیسے کوئی زخمی بے دم ہو کر گر جاتا ہے، میں بھی
تو زخمی تھی میری روح میں ڈرائیور نے نشتر چبھو دیا تھا جس کی نوک
باریک اور چمکدار نوک اب بھی احساس میں چبھ رہی تھی اور غالباً
ہمیشہ چبھتی رہے گی مسہری پر مجھے وہ سکون نہ ملا جو موٹر میں حاصل
تھا، کاش موٹر کبھی نہ رکتی اور میں اس میں بیٹھی بیٹھی زندگی کا سفر
طے کر لیتی، میرے نام کی نیند اڑ گئی تھی، جاگتے جاگتے صبح ہو گئی،
اور صبح کی روشنی کے ساتھ ساتھ صاحب بھی کمرے میں داخل ہوئے
انھوں نے مجھے پھیکی پھیکی نظروں سے دیکھا، لیکن نہ میرے
نکلس کی تعریف کی نہ ساری کے کونہ کو ماتھے سے لگایا، میرے
دل میں ان کی طرف سے نفرت کا ایک جذبہ پیدا ہوا مجھے یقین
ہو گیا کہ وہ میری توہین کر رہے ہیں مستقل اور دائمی توہین، وہ
تھوڑی دیر کھڑے گنگناتے رہے پھر غسل خانہ میں چلے گئے میرے خیالات
موٹر کی سی تیزی سے سڑک پر دوڑنے لگے، سورج نکل آیا تھا
لیکن میں ابھی تک اپنے ماحول پر چاندنی چھٹکی ہوئی چاندنی کو محیط
دیکھ رہی تھی، ڈرائیور کا بایاں ہاتھ میرے شانہ پر رکھا تھا اسکی گھڑی
کی باریک باریک آوازیں کانوں میں آ رہی تھیں، —— مگر وہ
رو دیا کیوں تھا یہ سوچتے سوچتے آٹھ بج گئے اور وہی بدزبان ملازمہ
چائے کی کشتی لئے کمرے میں داخل ہوئی، بیگم صاحبہ چائے
گئی میں نے سوچا آپ تھک گئی ہیں لاؤ آج کمرے ہی میں چائے

پلا دوں آپ کو۔ اُس نے طنز کے ساتھ چبھتی ہوئی نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا ——— لیکن اس کی بکواس پر غور کرنے کا وقت نہ تھا میں ڈرائیور کے چہرے پر بہتے ہوئے آنسوؤں کو دیکھ رہی تھی اور سوچ رہی تھی وہ رویا کیوں تھا۔ چائے سامنے رکھی ہوئی تھی پیالی سے ہلکی ہلکی بھاپ اُٹھ رہی تھی اور میں برابر یہی سوچ رہی تھی وہ رویا کیوں تھا؟

ڈاکیہ کا شب نامچہ

دن بھر کی دوڑ دھوپ کے بعد رات کو بستر پر لیٹتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کسی اور دنیا میں پہونچ گیا، عجیب خاموش اور رومانی دنیا میں، جہاں خیالات اور تصورات کی آوازیں مدھم ہو جاتی ہیں اور دل و دماغ پر سکون و اطمینان کی بارش ہونے لگتی ہے ——— میری راتیں آرام و مسرت اور حسن و شباب کے جلوؤں سے لبریز ہوتی ہیں میں نے غلط نہیں کہا کہ بستر پر لیٹتے ہی میں کسی اور دنیا میں پہنچ جاتا ہوں رنگین اور عجیب دنیا میں اس وقت دس بجے کے قریب کھانا کھا کر بستر پر پہونچا میرے چھوٹے سے کچے گھر میں حبس کا فرش جگہ جگہ سے کھدا ہوا تھا اور دیواروں پر بڑے بڑے نشانات نمایاں تھے مٹی کے تیل کی ڈبیہ جل رہی

تھی دھوئیں کی موٹی سی لکیر ڈبیہ کی پیلی اور دھندلی لو پر تھرک رہی تھی لیٹے ہی میں نے دن کے دلچسپ واقعات پر تبصرہ شروع کر دیا، اور سارے واقعات ایک ایک کر کے آنکھوں کے سامنے آ گئے، چبوترے والے گھر میں سے جو دوشیزہ میری آواز سن کر نکلی تھی اور جسے میں نے تین آنے کا بیرنگ خط دیا تھا وہ ضرور اس قابل تھی کہ میرے پاس جتنے بھی آنے اور تھے وہ سب اسے دیدیئے جاتے مگر میں تو صرف ایک ننھی سی جان تھا پھر بھی دل تو میرے پاس تھا، اس کے چہرے کی معصومیت اور آنکھوں کی دل فریب نیلاہٹ کو میں کبھی بھول ہی نہیں سکتا اور پھر اتنے نازک حسین اور سڈول جسم پر وہ بلگچی ساڑی کیا بھلی معلوم ہو رہی تھی گویا بڑی قیمتی، چمکدار اور رنگین ساڑی ہے، بیرنگ لفافہ لے کر اس کے منہ پر جو ہوائیاں اڑنے لگی تھیں وہ بھی دیکھنے ہی سے تعلق رکھتی تھیں غنیمت ہوا کہ ڈھائی آنے اس کے پاس نکل آئے ورنہ جس طرح دو پیسے مانگ لئے ادھار کئے پورے تین آنے ہی چھوڑنے پڑتے دیکھنا یہ ہے کہ ان دو پیسوں کی ادائیگی وہ کس انداز سے کرتی ہے اور کرتی بھی ہے یا یوں ہی ٹال دیتی ہے میں کہتا ہوں دو چار پیسے ایسے موقعوں پر ہر ایک نوجوان ڈاکیہ کی جیب میں ہر وقت موجود رہنے چاہئیں کالج سے آئی ہوئی لڑکیوں کے پاس ان کے دوست جو خطوط بھیجا کرتے ہیں ان پر ایک دو پیسے کا ٹکٹ دانستہ کم لگاتے ہیں مطلب یہ ہوتا ہے کہ خط بیرنگ ہو کر محفوظ ہو جائے اور ابا جان کی متجسس اور عینک پوش نگاہیں اسے نہ دیکھ

لیں، رہا چھٹی رساں نوجوان اور کنوارا چھٹی رساں وہ عورت کے
ہاتھ کا پتہ دیکھتے ہی خط پڑھنے کے جنون میں اپنی ساری مہارتیں لفافہ
کھولنے میں صرف کر دیتا ہے اسی کے ساتھ کوئی اُس کے برابر رازدار
بھی نہیں ہوتا وہ ——— آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں
کی صحیح اور عملی تصویر بن جاتا ہے، ——— بیرنگ خط بھیجنے والے
بیوقوف لونڈوں کو یہ تو خبر ہوتی نہیں کہ ڈاک خانہ کے سارے ڈاکیہ
بوڑھے نہیں ہوتے ان میں کچھ نوجوان بھی ہوتے ہیں جو حُسن و عشق کی
داستانوں کو بڑے شوق سے پڑھتے ہیں اور ان اشعار کو تو زبانی یاد کر لیتے
ہیں جن کو وہ بیانو پر گانے کے لئے بڑے ذوق اور اضطراب کے ساتھ
نہایت خوشخط لکھ کر بھیجا کرتے ہیں بات یہ ہے کہ نوجوان ڈاکیہ اور بوڑھا
باپ اپنے ذوق اور تجربہ کے لحاظ سے کافی خطرناک ہوتا ہے،

نیم والے گھر سے اُس کنجی آنکھوں اور بھورے بالوں والی دوشیزہ
نے کسی طرح دروازے سے سر نکالا تھا، جیسے سورج مکھی کا پھول آفتاب
کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا ہو، پوسٹ مین صاحب بیرنگ ہے تو لے
جائیے میرے پاس اس وقت چار پیسے نہیں ہیں۔

ارے پیسے نہیں ہیں تو یہ بیچارہ اپنے ماں باپ کا لاڈلا جس نے تجھے
نہ معلوم کے گھنٹے ضائع کر کے یہ اپنا روزنامچہ بھیجا ہے جسمیں جگہ جگہ پانی کی
بوندیں ٹپکا کر اپنے رونے کا عملی ثبوت بہم پہونچایا ہے خط کی واپسی پر کہیں
ڈوب ہی مرے گا یا ریل کے سامنے لیٹ کر جان دیدیگا اسے اتنی

ہمت تو کبھی نہ ہوگی کہ بغیر ٹکٹ ریل میں بیٹھکر یہاں چلا آئے اور
جب میں نے کہا واپس کرنیکی کیا ضرورت ہے رہنے دیجئے پیسے پھر
مل جائیں گے تو کس طرح اس نے مسکرا کر کہا ـــــ تھینک یو ویری
مچ! واہ ری میری ایرانی بلّی جیسے میں بھی کسی کالج کا کنوارا لڑکا ہی تو
ہوں اور سامنے والی بنچ پر بیٹھا ہوا تیری پیلی پیلی آنکھوں کے تیر دل سے
زخمی ہو رہا ہوں، روز تو لڑکے کو بھیجا کرتی تھی آج خود ہی آ گئی معلوم تھا
تاکہ بیرنگ خط آئیگا اور چٹھی رساں سے بغیر پیسوں ہی کے وصول کرلی
اور پھر کس دیدہ دلیری سے کہتی ہے پوسٹ مین صاحب بیرنگ ہی
دے جایئے میرے پاس اس وقت چار پیسے نہیں ہیں!

سچ تو یہ ہے خط بانٹنے کا لطف ہی اس وقت آتا ہے جب کالجوں میں
چھٹی ہو اور یہ بی۔ اے۔ ایم، اے میں پڑھنے والی معصوم قیامتیں اپنے
اپنے گھروں کو آجائیں پھر دیکھئے ڈاکیہ پر کیسی کیسی بجلیاں ٹوٹتی ہیں
غصہ کے لئے! ان کی ساری توجہات سمٹ کر ڈاکیہ پر منڈلانے لگتی
ہیں کوئی بڈھا ڈاکیہ ہو تو یہ بجلیاں چمکنے اور کوندنے کے بعد اس طرح اس
کے بجھے ہوئے دل پر گر پڑتی ہیں جیسے جلے ہوئے کپڑے کی راکھ پر کوئی
چنگاری ڈال دیجاتی ہے جس سے نہ دھواں اٹھتا ہے نہ شعلے
ہیں لیکن نوجوان ڈاکیہ کا دل تو بس طور بن کر رہ جاتا ہے نگاہوں کے
ان شراروں سے اس کی ساری کائنات پھنک جاتی ہے اسکی
راتیں بیدار ہو جاتی ہیں دل کی دھڑکنیں اتنی بڑھ جاتی ہیں کہ

وہ گن بھی نہیں سکتا، دن میں جس وقت ڈاک تقسیم ہوتی ہے یہ اسی وقت ڈاکیہ کے آنے کی منتظر رہتی ہیں اور دیدے پھاڑ پھاڑ کر اسے دیکھتی رہتی ہیں اتنا انتظار تو یہ کالج کے کمروں میں ان شریر لونڈوں کا بھی نہ کرتی ہونگی جو انھیں بیرنگ خط بھیجکر غریب چٹھی رساں کے حسن ذوق کا امتحان لینا شروع کر دیتے ہیں، آج بھی کالج میں گرمیوں کی چھٹی ہے جب ہی تو تنہائی کے دن اس لطف سے گذر رہے ہیں بوڑھی بچیوں کا کسی وقت خیال ہی نہیں آتا اور وہ کالی کلوٹی کڑکناتھ نسل کی لڑکی جو عشق بازی کی بدولت دو سال سے ایف، اے میں فیل ہو رہی ہے جب تک کالج میں رہتی ہے ماں باپ سے فیس اور مصارف خوراک کے نام سے روپیہ منگاتی رہتی ہے اور جب گھر آتی ہے تو ان غریبوں پر بیرنگ خطوں کے محصول کا بوجھ پڑ جاتا ہے اور صورت دیکھو تو اچھی خاصی مینارکا کی بھٹور معلوم ہوتی ہے اور پھر مذاق بھی کرتی ہے کمبخت ہمیں کی کہتی ہے روز بیرنگ خط لے کر آجاتے ہو منی آرڈر کبھی لائے کسی دن؟ —— ارے تو آئینہ میں اپنی صورت تو دیکھ یہی غنیمت ہے کہ کوئی بدنصیب اچھوت لڑکا تیرے لئے بیچارہ پیسے خرچ کر کے خط ہی بھیج دیتا ہے بھلا منی آرڈر کہاں سے آئے گا تیرے پاس؟

اور ہاں وہ بیگم صاحبہ جو اپنے چچا کے یہاں تھانہ کے قریب رہتی ہیں اور اپنے آپ کو مس صاحبہ، مس صاحبہ کہتے کہتے تھک

جاتی ہیں ـــــ بھائی آفت کا پرکالہ ہے اُسے کسی کل چین ہی نہیں
بولتی تو اس قدر تیز ہے کہ بات تک سمجھ میں نہیں آتی پھر آنکھیں تو ایسی
مٹکاتی ہے کہ آدمی دیکھتا ہی رہجاتا ہے تم سے کم ڈاکیہ تو ضرور دیکھتا
رہجاتا ہے ـــــ پوسٹ مین صاحب لیٹر ہے کوئی ہمارا؟ ـــــ
ارے اتّا ذرا پوچھو تو آواز دیکر مس صاحبہ کا کوئی لیٹر ہے؟ اور پارسل؟
ـــــ کچھ بھی نہیں روز تو دوڑ دوڑ کر مس صاحبہ خط لے جاتی رہیں
آج ایک آنہ کا بیرنگ لفافہ آگیا تو کہدیا اب کل لانا پوسٹ مین صاحب
دیکھوں کہاں سے آیا ہے! ـــــ اور مس صاحبہ نے دیکھنے کی جگہ
اُسے سونگھنا شروع کردیا گویا خط کو کسی خاص خوشبو میں بسا کر بند کرنے
کی قرارداد پہلے سے طے تھی، اور جہاں جہاں سے آپ کے پاس خط
آسکتا ہے مس صاحبہ آپکو اچھی طرح معلوم ہے یہ دوسری بات ہے کہ
آپ کسی خاص عطر کو زیادہ پسند کرتی ہوں بھلا کسی انجان کو کیا پڑی تھی
جو آپ کو ایسا بوجھل لفافہ بھیجدیتا یہ معلوم ہوتا ہے خط نہیں کوئی مضمون
ہے جو کسی نومشق مضمون نگار نے کسی رسالہ کے ایڈیٹر کو اناڑی سمجھ کر
بھیجدیا ہے اور وہ اس کے بڈھے چچا کی ملازمہ تو سایہ کی طرح اس
کے ساتھ رہتی ہے جیسے خط بھیجنے والے سے ملاقات کرنے وہ
اُڑ کر ہی چلی جائے گی ـــــ بٹیا ـــــ اسے بٹیا جلدی آئیے
صاحب بلاتے ہیں، مس صاحبہ! مس صاحبہ!!
واہ رے صاحب کے بچے بیٹھے ہیں پورے دو سو تو ملتے بھی نہیں

اور کوئی سوٹ سات سال سے کم کا نہیں آپ کے پاس اور بنے پھرتے
ہیں صاحب! ——— صاحب، اور مس صاحبہ! بھلا اس حماقت کی
بھی کوئی حد ہے یوں تو میں بھی اپنی بیوی سے کہہ سکتا ہوں کہ مجھے صاحب کہا
کہا کرو اور وہ کہہ بھی دیا کرے گی مگر کیا میں اس کے صاحب کہہ دینے سے
صاحب " بن بھی سکوں گا صاحب بننے کم سے کم پانچسو روپئے مہینہ کی
تو آمدنی ہونی چاہئے اور دس پانچ بڑے چھوٹے جوتے، دو چار سوٹ
اور ایک آدھ سوٹ کیس بھی ضروری ہے جب کہیں آدمی صاحب
بن سکتا ہے ورنہ یوں تو ہم اب بھی صاحب ہیں، مس صاحبہ تم ہی ہمیں
دن میں دو مرتبہ پوسٹ مین صاحب کہتی ہو، آج کل تو شہر میں ان
لونڈیوں کے سوا کسی کی ڈاک آتی ہی نہیں،

میر صاحب کی لڑکی کے نام تو پرسوں کسی احمق نے یوں ہی کھلا
ہوا لفافہ بھیج دیا بس ایک کونہ ہی چپکا ہوا تھا اور پھر خط بھی ایسا گندہ
کہ پڑھتے پڑھتے میری آنکھیں مارے شرم کے بند ہوئی جاتی تھیں
وہ تو یہ کہئے کل رات کو نیند دیر میں آئی اور بچی ہوئی ڈاک کی پڑتال
کرتے کرتے اس لفافہ پر نظر جا پڑی نکال کر پڑھنے لگا کیسی کیسی باتیں
لکھی تھیں اُس میرے یار نے خدا کی قسم میں نے تو کبھی اپنی بیوی کو
بھی اس بے تکلفی سے خط نہیں لکھا یہ تو خیر کچھ معمولی بات تھی۔
کل ایک بے وقوف نے خان بہادر صاحب کی بیٹی کو باپ کے پتہ پر
لفافہ ٹکا دیا اور لطف یہ کہ پتہ پر خان بہادر ہی کا نام تھا، ان کے

"کیرآف" بھی نہیں تھا وہ پڑھنے میں مصروف ہوئے ہیں ذرا حقہ کا دم لگانے کو ٹھہر گیا اور مونڈھے پر بیٹھ کر ابھی اچھی طرح دم بھی نہ لگانے پایا تھا کہ خان بہادر کے تیور بگڑنے لگے، اور بینتر ا بدل کر مجھ سے پوچھا کس کا ہے جی یہ خط؟ ——— بیہودہ بدذات بے شرم کہیں کا یہ کہہ کر انھوں نے خط لفافہ میں رکھا اور چلم میں ڈال دیا، حقہ تھی بدمزہ ہو گیا چلم بھڑک گئی اور اس غریب کے جذبات بھی خاکستر ہو کر رہ گئے ——— واہ رے خان بہادر آپ کا غصہ خط تو جلا دیا اور صاحبزادی کو چھٹی ختم ہونے سے دو روز پہلے ہی کالج بھیج دیا یعنی باپ کے نام خط منگانا جرم ہے زبانی بات چیت میں کوئی ہرج نہیں" ——— یہ ہے خان بہادری!

ہمارا منی آرڈر بھی لائے؟ ——— یہ الفاظ تو میرے دل میں چبھکر ہی رہ گئے اسی کے ساتھ دو بڑی آنکھوں میں رنج کے جذبات مچلتے ہوئے دیکھکر میں تڑپ گیا نشیلی اور معصوم آنکھوں میں جواب بھی مجھے دیکھ رہی تھیں ناکامی اور مایوسی کی ماری ہوئی محلہ کا نستان کی یہ دوشیزہ اتنے دنوں سے مجھ سے پوچھ رہی ہے کہ اب تو مجھے انکار کرتے ہوئے شرم سی آنے لگی دو چار روز اور یوں ہی وہ پوچھتی رہی تو تعجب نہیں کہ مجھے چار چھ روپئے کا منی آرڈر خود ہی اس کے نام کرنا پڑے کس آس کے ساتھ مجھے دیکھ کر وہ پوچھتی ہے آج ہے ہمارا منی آرڈر بابو جی؟

بابوجی کے لفظ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ میرا مرتبہ بڑھا کر مجھے خوش کرنا چاہتی ہے جیسے خوش ہو کر میں اُس کا منی آرڈر دے ہی دونگا اور خفا ہو گیا تو واپس کر دونگا یا کوئی بیرنگ خط ہی دیدونگا اس کے خیال میں ڈاکیہ کوئی بڑی ہستی تھی، آج تو اُس کی صورت اتری ہوئی تھی شاید اس نے کھانا نہیں کھایا تھا حالانکہ میں ڈھائی بجے کے بعد ہی اس کے گھر کے سامنے سے گذرا تھا —— رات بہت جا چکی تھی آنکھوں میں نیند کا نام نہ تھا لیٹے لیٹے اُٹھ کر ٹہلنے لگی سامنے ہی کھونٹی پر تھیلا لٹکا ہوا تھا چمڑے کا بادامی رنگ کا نیا تھیلا جس کا سنہری کندہ دھندلی روشنی میں سونے کی طرح چمک رہا تھا میں نے سوچا لاؤ دو چار خط ہی نکال کر پڑھوں —— کارڈوں میں تو کوئی دلچسپ بات نہیں! دو چار لفافوں کو الٹ پلٹ کر دیکھا ان میں سے کوئی بھی کسی لڑکی کے نام نہ تھا —— ایک لفافہ احتیاط سے کھولا خط تو بہت مختصر تھا زیادہ دلچسپ بھی نہ تھا البتہ تین چار عریاں تصویروں نے تنہائی کے چند منٹ صرف کرا دیئے آج تک میں نے ایسی فحش تصاویر کبھی نہ دیکھی تھیں میں لفافہ کھول کر کافی شرمندہ تھا معلوم نہیں آرٹ کو اس عریانی سے کیا تعلق تھا اگر آرٹ کسی اخلاق کا پابند کب ہے؟ اور ایک مرد کے پاس انھیں کیوں بھیجا گیا تھا خط پر کسی کے دستخط نہ تھے طرز تحریر سے لکھنے والی عورت معلوم ہوتی تھی —— سنا ہے ایسے آلات ایجاد ہو چکے ہیں کہ خط کی تحریریں بغیر کھولے ہی ان کی مدد

سے پڑھ لی جاتی ہیں، اگر یہ صحیح ہے تو بھی ان تصاویر کو پڑھنا ممکن نہ
نہیں۔ اور اس میں کوئی شک بھی نہ تھا کہ ان تصاویر کا پڑھنا بالکل ناممکن
تھا، پھر دو چار لفافوں کو الٹ پلٹ کر دیکھا ایک لفافہ کا پتہ بہت
پیچیدہ تھا معلوم نہیں کس کے مکان پر ہو جگہ کس کو ملے سرستی؟ —
— کون سرستی؟ —— دو دن ہو گئے تھے یہ سرستی دیوی ملتی
ہی نہ تھیں اس وقت غیر اختیاری طور پر میرے کانوں میں وہ
الفاظ گونجنے لگے جو کئی دن سے ایک حسین دوشیزہ کے منہ سے
نکل رہے تھے حسین اور بے کس دوشیزہ کے منہ سے ہمارا منی آرڈر
بھی لائے یا یوں ہی؟ —— ننگی تصویریں دیکھ کر جی تو نہ چاہتا تھا
کہ اس لفافہ کو کھولوں اور کسی کا راز ٹٹولوں، دل نہ مانا اور اپنی مخصوص
مہارت سے کام لے کر لفافہ کھول لیا ایک بڑا سا کاغذ جس پر چھپی
چھپی چند سطریں لکھی ہوئی تھیں لپیٹا ہوا رکھا تھا کھول کر دیکھا
تو اندر دس روپیہ کا ایک نوٹ تھا —— ارے یہ نوٹ؟ اور
میری بیوی بھی تو کئی دن سے دس روپئے مانگ رہی ہے تنخواہ
ملنے میں ابھی بہت دیر ہے اور کہیں سے دس روپئے ملنے کی
توقع نہیں خان بہادر صاحب نے عید کا انعام اب تک نہیں دیا
نہ معلوم اس خط سے کچھ چڑھ گئے کیا، مگر اس میں میرا کیا قصور
تھا اور وہ بہت فیاضی سے کام لیں گے تو بھی دس روپئے تو دینے
سے رہے بہت دیئے تو دو ڈیڑھ لاؤ ابھی دس روپئے نہ بھیج دل

اچھا بیوی کو لکھا ہے پھٹا ہوا پاجامہ پہنکر عید کی، ضرور بھیج دیئے جاہیں آخر اس احمق نے خط میں نوٹ رکھا ہی کیوں؟ منی آرڈر کرنا چاہیے تھا ضرور اس بیوقوف کو سزا دینی چاہیے ——— دوشیزہ کے وہی الفاظ میرے کانوں میں پھر گونجے ہمارا منی آرڈر بھی لائے

بالو جی! ——— ارے کہیں سرستی اُسی کا نام تو نہیں اگر ایسا ہے تو میں کبھی یہ نوٹ نہ دونگا میری بیوی کا پھٹا ہوا پاجامہ اس غریب کی آس بھری نگاہوں سے زیادہ دردانگیز نہیں ہوسکتا میری بیوی کی اور کوئی تکلیف بھی اسکی بھوک سے زیادہ روح فرسا نہیں ہوسکتی وہ غریب کتنے دنوں سے اُمید لگائے بیٹھی ہے اُسے خبر بھی نہیں کہ اس کا منی آرڈر اس لفافہ میں بند ہے اور نوجوان ——— دردمند ڈاکیہ کے لئے سرستی کا نام ایک معمہ بن کر رہ گیا ہے اس کے الفاظ برابر میرے کانوں میں گونج رہے تھے بابو جی منی آرڈر لائے ہمارا ——— مجھے پسینہ آگیا میں نے نوٹ رکھ کر جلدی سے لفافہ بند کر دیا اور یہ طے کر لیا کہ صبح کو اچھی طرح اس معاملہ کی تحقیقات کر کے یہ خط اُس عورت کو دیدونگا بشرطیکہ وہی سرستی ہوئی، دو تین لفافے اور پڑے تھے رومان کسی میں نہ تھا، اور ہوتا بھی کیوں رومان تو کالج کی چھیلوں سے مخصوص ہو کر رہ گیا ہے ——— مقدمہ بازی کے قصوں اور بے لطف باتوں کے سوا ان میں کوئی چیز نہ تھی اور رومان پرست آدمی حسن چیز کو سب سے

زیادہ ناپسند کرتا ہے وہ یہی مقدمہ بازی ہے جس میں ساٹھ سال کے سفید مونچھوں والے جج اور لالچی وکیلوں کے علاوہ کسی ہم جنس آدمی سے واسطہ ہی نہیں پڑتا، عرائض نویس چپراسی، اہلمد، ناظر غرض مقدمہ بازی کے سارے لوازم حسن و محبت کی دنیا سے نکالی ہوئی چیزوں اور ہستیوں سے ملکر بنے ہیں ——— مجھے طلاق کے ایک مقدمے سے دو چار دن صرف اس لئے دلچسپی رہی تھی کہ شوہر جوان تھا اور اسکی بیوی حد درجہ حسین، لیکن لالچی رشتہ داروں نے صرف روپے کے لئے سارس کے اُن معصوم بچوں کو جو محبت کی حسین وادیوں میں اچھی طرح اڑنے بھی نہ پائے تھے بچھڑ جانے پر مجبور کر دیا تھا، میں نے تھیلا کھونٹی پر لٹکا دیا ڈبیہ کی کو کو انگلی سے دبا کر اسے بجھا دیا اور آنکھیں بند کر کے پڑ رہا۔

صبح کو وہ لفافہ تقسیم ہو گیا میرا خیال ٹھیک نکلا وہی عورت سرستی تھی اُسی دن پوسٹ ماسٹر نے پوچھا تمہارے حلقہ کی ڈاک تقسیم ہو گئی ——— سب بٹ گئی کوئی خط بچا تو نہیں ——— اور لفافہ کوئی ——— وہ لفافہ تم نے کس کو دیا، کب دیا؟ انھوں نے غور سے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ اب تک تمہارے پاس ہی تھا کیا سرستی کوئی غیر معروف عورت ہے؟ انھوں نے بڑی رازداری کے ساتھ پوری تحقیقات کی کہ لفافہ صحیح پتہ پر محفوظ طریقہ پر پہونچ گیا یا نہیں اور نوٹ بھی سرستی کو ملا یا نہیں،

معلوم ہوا اس بستی کا بھائی سپرنٹنڈنٹ صاحب کا چپراسی تھا انھوں نے امتحاناً نوٹ لفافہ میں رکھکر بھجوایا تھا اگر کہیں میں نوٹ نکال لیتا تو آفت ہی آگئی تھی ——

ٹکٹ کلکٹر کا شب نامچہ

نو بجے ہی کھانا کھا کر میں اسٹیشن پر آگیا دسمبر شروع ہو چکا تھا سردی اتنی تو نہ تھی کہ صبح کو مشرق سے نکلتے وقت یا شام کو مغرب میں ڈوبتے وقت سورج میں کپکپی محسوس ہوتی لیکن اس حد تک شدید ضرور تھی کہ ایک ہفتہ سے مجھے گرم سوٹ پہن کر ڈیوٹی پر آنا پڑتا تھا گورے چٹے آدمی پر سنا ہے نیلے رنگ کا سوٹ خوب پھبتا ہے یہی وجہ تھی کہ اسٹیشن پر کوئی گاڑی آکر ٹھہرتی تو میں پلیٹ فارم پر ٹہلنے لگتا کھڑکیوں کے دھندلے آئینوں میں جو رات کو بجلی کی روشنی میں کافی چمکنے لگتے ہیں اپنی صورت دیکھا کرتا اور دل ہی دل میں یہ فیصلہ کر لیا کرتا کہ آج ضرور کوئی نہ کوئی رومانی حادثہ پیش آجائے گا۔ نیلا گرم سوٹ میرے قدرتی حسن میں اتنی کشش ضرور پیدا کر دیتا تھا کہ میں ایسا خیال کرتے ہیں حق بجانب کہا جا سکتا تھا زنانہ ڈبہ کے قریب پہونچکر پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ڈالنے کے بعد میں گنگنانا شروع کر دیتا بہت سی سادہ لوح اور معصوم عورتوں

کی آنکھیں میری طرف اُٹھ جاتیں دل پر آنکھوں ہی کے راستے تیر چلائے جاسکتے ہیں اس لئے میں کسی حسین دوشیزہ کی نگاہوں میں اپنے حُسن کو زیادہ سے زیادہ پرکشش بنانے کی کوشش کرتا دل میں پہونچنے کا قریب ترین راستہ آنکھیں ہی تو ہیں۔

آج بھی ٹوپی کے چھجے کو پیشانی سے ذرا اونچا کر کے جیبوں میں ہاتھ ڈال کر میں ایک زنانہ ڈبہ کے پاس پہونچ گیا چند کالی بدنما صورتیں آنکھوں کے نیچے سیاہ کی طرح ہلتی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں کسی کے کانوں میں چاندی کے بھاری بھاری بالے پڑے ہوئے تھے جو پسینہ میں بھیگتے بھیگتے سیاہ ہو گئے تھے کسی موٹی اُدھ کھدی ناک میں سونے کا بڑا سا بڑا دو بلاق لٹک رہا تھا جس کی نوک پر پان کی گاڑھی پیک کا ایک آدھ قطرہ اس طرح منجمد ہو کر رہ گیا تھا جیسے کسی پرند کو ذبح کر دینے کے بعد چاقو کے پھل پر خون کی کوئی بوند جم جایا کرتی ہے کوئی غریب ماتھے پر چاندی کا وزنی ٹیکہ رکھے بھوکی بلی کی طرح جھانک کر خوانچہ والوں کو دیکھ رہی تھی ظاہر ہے کہ بکریوں کے اس ریوڑ سے مجھے کوئی دلچسپی نہ ہو سکتی تھی نہ ان میں میرے لباس اور رنگ کی موزونیت نیز جسم کے حسین تناسب پر تبصرہ کرنے کی اہلیت تھی، بھوک صنفی خواہشات کی سب سے بڑی دشمن ہے پیٹ خالی ہوتا ہے تو دل و دماغ میں امنگیں پیدا نہیں ہوا کرتیں در حقیقت امنگیں غذا کے ابال ہی کا ایک موزوں نام ہے جب پیٹ کی ہانڈی ابلنے لگتی ہے تو امنگیں بھاپ بن کر دماغ

میں پہونچنا شروع ہو جاتی ہیں جو آنکھیں پیٹ کے اشاروں پر باسی پھلکیوں
سڑتے ہوئے دہی بڑوں اور تیل کی کچی پوریوں پر پوری حرص کے ساتھ
جم کر رہ جائیں وہ حسن کی نزاکتوں پر غور کرنے اور ان سے حظ اندوز ہونے
کی صلاحیت سے لازمی طور پر محروم ہو جاتی ہیں ——— میں نے ان بے
حسن عورتوں کی طرف نفرت سے دیکھا اور ان کے سنولائے ہوئے چہروں
کو حسن و عشق کی چمک سے خالی پاکر جلدی سے آگے بڑھ گیا ——— یہ
پسنجر ٹرین تو میری ڈیوٹی میں آیا ہی نہ کرے تو اچھا ہے میں نے انگریزی
میں سوچنا شروع کیا اس سے تو مال گاڑی ہی اچھی کم سے کم نگاہیں تو خراش
سے محفوظ رہتی ہیں احساس کو تو کوئی دھکا نہیں لگتا اس گاڑی کو بڑے
بڑے اسٹیشنوں پر رکنا ہی نہ چاہئے حسن کی یہ کثافت دیہات میں پھینک
دینی چاہئے، کالی بلائیں چھوٹی آنکھوں اور چپٹی ناک والی بدصورت
عورتیں جن کی تخلیق صرف برتن مانجھنے اور روٹی پکانے ہی کے لئے ہوئی
ہے مرد اور اس کے جذبات لطیف سے انھیں کیا تعلق ہے ———..
کھٹی پیسہ بھی عجیب چیز ہے اسی کی بدولت یہ کلوا چمار کی ماں نہیں
گاڑی میں لدی ہوئی آج جھانسی کے اسٹیشن کی ہوا کھا رہی ہیں اور چمک
کے روندے ہوئے کالے چہروں سے ہمارے جذبات پر حملہ آور ہو رہی
ہیں ایکسپریس اور میل میں دو چار صورتیں تو ڈھنگ کی نظر آجاتی ہیں کل
ہی کرسچین کالج کی جو لڑکیاں قیامت اچھالتی ہوئی لکھنؤ گئی ہیں وہ ہیں
صحیح معنی میں حوا کی چہیتی بیٹیاں! ——— بھک! بھک!! ———

دھڑ دھڑ!! پشاور ایکسپریس فراٹے بھرتا آگ اور دھواں اگلتا ممبئی
کیطرف سے چلا آرہا تھا میں چونک کر بنچ سے اُٹھ کھڑا ہوا، ہرنشیندر بابو نے
میرے کندھے پر ہاتھ رکھکر کہا گاڑی سگنل کے اندر آگئی! ——

بابو سگریٹ ہے کوئی سالا بیڑی پیتے پیتے منہ سڑ گیا نکالو بابو جلدی نکالو
پارسل پڑے ہیں پلیٹ فارم پر! میں ہرنشیندر کی طرف سگریٹ بڑھاتے
ہوئے دوسرے پلیٹ فارم کی جانب بھاگا اور لائنوں کو پھلانگتا ہوا پل
کے نیچے جا کھڑا ہوا! اس وقت مجھے دو چار اسٹیشن دہلی کی طرف جانا تھا
میں نے طے کر لیا تھا کہ دہلی اور کانپور کی گاڑیوں میں جو زیادہ عجیب
ہوگی اُسی کے ساتھ چلا جاؤں گا ڈیوٹی کرنی ہے تو لطف اور زندگی کے
احساس میں کرنی چاہئے مگر جی انسپکٹر کی طرح موت اور بے حسی کی
ڈیوٹی جسمیں سارے جذبات کاٹتے اور رسید بک میں بند ہو کر رہ
جائیں، کس کام کی! —— میں نے انگریزی میں دو تین گالیاں دیں!!

گاڑی آہستہ آہستہ ایک بڑے بھاری اژدھا کی طرح بل کھاتی
ہوئی پلیٹ فارم پہ آگئی تھی انجن آگ اور دھوئیں کا لاوا اگل رہا تھا ڈرائیور
اور فائرمین دھوئیں کی چادر کے اس پار کھڑے ان دوزخی روحوں کیطرح
جھانک رہے تھے جنھیں ایک معینہ مدت کے بعد جہنم سے نکل کر جنت میں
پہونچ جانے کی پوری توقع ہو اور جنت کے تمام حسین تصورات ان کے
ذہن و دماغ پر چھائے ہوئے ہوں جو کبھی کبھی ان کی نگاہوں کو کسی ٹھنڈی
فضا تک کھینچ لانے میں کامیاب ہو جاتے ہوں، ڈرائیور نے چہرے کے

سیاہ دھبوں میں سفید دانتوں کی چمک پیدا کر کے سلام کیا میں نے
سر کی جنبش سے جواب دیا اور مسکراتا ہوا آگے بڑھ گیا فرسٹ کلاس میں
چند یورپین جن کو افلاس اور فاقہ کی بیداری کے علاوہ غالباً ہر چیز کا تجربہ
تھا قیمتی کمبلوں میں لپٹے ہوئے سو رہے تھے شراب کی گرمی خون کی سرخی
بن کر ان کی رگوں میں دوڑ رہی تھی ولایتی اور قیمتی شراب جو توس
اور مکھن کی چکناہٹوں اور حکومت کی سرشاریوں کے ساتھ ساتھ پوری فیاضی
سے قدرت نے ان کی قسمت میں لکھ دی ہے جیسے جہالت، غربت اور محکومی
ہندوستانیوں کے نام درج کر دی گئی ہے یہ جانتے بھی نہ تھے سردی
کسے کہتے ہیں اور بھیڑ میں لکڑی کے تختوں کی تنگی اور تنگ سیٹ پر اکڑوں
بیٹھ کر اونگھنے میں کیا لطف ہے، سیکنڈ کلاس، دو تین صاف ستھرے سیکنڈ کلاس
اور اس کے بعد میلے، بدبودار تھرڈ کلاس جن میں تلے اوپر مسافر بھرے
ہوئے تھے اور اسٹیشن کی ٹھنڈی فضا کا اپنے بھیانک چہروں سے خیر مقدم
کر رہے تھے پھر ایک زنانہ تھرڈ کلاس جس میں چند نوعمر اور خوبصورت دوشیزائیں
جاپانی سلک کے ٹھنڈے مگر چمکیلے کپڑے پہنے ٹھٹھر رہی تھیں ان کے زرد
بے رونق اور سوکھے ہوئے گالوں پر نہ مکھن کی چکناہٹ تھی نہ سیب
اور سنترے کے رس کی سرخی تیز اور ٹھنڈی ہوا کے تھپیڑوں سے ان کے
ابھرے ہوئے رخسار جل گئے تھے جیسے رات کے پالے سے گلاب اور
چنبیلی کی کلیاں جل جایا کرتی ہیں وہ بغلوں میں ہاتھ دیئے کانپ رہی تھیں
کچھ ادھیڑ عمر کی عورتیں سیٹ پر لیٹی اپنی سکڑی ہوئی خالی چھاتیوں کو بھوکے

بچوں کے منہ میں ٹھونس کر ان کی چیخوں کے تسلسل کو جو کبھی کبھی کشمکش کی جاگتی ہوئی فضا کو چیرتی پھاڑتی دور تک پہونچ جاتی تھیں، توڑنے کی ناکام کوشش کر رہی تھیں ان میں سے کسی کے پاس کمبل نہ تھا کمبل تو کیا مجھے یقین تھا کہ سب کے پاس ٹکٹ بھی نہ ہوگا لیکن ایسے موقعوں پر میں اپنے فرائض سے آنکھ چرا لیا کرتا ہوں، کسی غریب کے گلے میں اونی سویٹر تو کیا ٹھنڈے کپڑے کی دوہری واسکٹ بھی نہ تھی میں ان تاثرات میں کچھ ایسا محو ہوا کہ حسن پر تبصرہ کرنے کی جگہ ان کی غربت کے دلدوز حالات پر غور کرنے لگا جس نے انھیں انسانیت، زندگی اور تہذیب کے ڈانڈے سے دور لیجا کر زکام، کھانسی اور نمونیا کی سرحد پر کھڑا کر دیا تھا میں ان کے اور اپنے کپڑوں کے متعلق کچھ سوچتا اور سیٹی بجاتا آگے بڑھ گیا، اس کے بعد پھر ایک سیکنڈ کلاس تھا اس کے سامنے پلیٹ فارم پر چمڑے کے دو تین بکس ایک عمدہ قسم کا ہولڈال اور چند مختلف چیزیں بکھری پڑی تھیں قریب ہی ایک نازک اندام دوشیزہ سمور کا اوور کوٹ پہنے میری طرف پشت کئے کھڑی تھی، سیاہ بالوں کی لٹیں اس طرح اس کے دونوں کندھوں پر بکھری ہوئی تھیں جیسے افق پر شام کے دھندلکے مچلا کرتے ہیں، میں نے ٹھہر کر سامان کو غور سے دیکھا گویا میں اس کے وزن کا اندازہ کر رہا ہوں اب دوشیزہ، شوخ اور بیباک دوشیزہ میری طرف متوجہ ہو چکی تھی اس کا سرخ و سفید رنگ جو ابھرے ہوئے گالوں پر اور زیادہ گہرا ہو گیا تھا نہ صرف میرے جذبات میں نشتر چبھو رہا تھا

بلکہ میری روح کی گہرائیوں کو بھی ٹٹول رہا تھا، اسکے تیلے اور پوری کاریگری سے ڈھالے ہوئے ہونٹ جن سے حسن الفاظ بنکر نکل رہا تھا متواتر اپنا کام کر رہے تھے وہ قلیوں کو مسلسل ہدایت دے رہی تھی، کان پور وانی ٹرین میں ـــــ بکس کے اوپر بکس مت رکھو تم صراحی اٹھا لو، ـــــ دوسرے ہاتھ میں ناشتہ دان اٹھاؤ!

اس کی چمکدار اور بڑی آنکھوں میں جو لمبی اور گھنی پلکوں کی چھاؤں میں یوں چمک رہی تھیں جیسے جنگلی جھاڑیوں کی گود میں ٹھنڈا چشمہ لہریں لیا کرتا ہے، جوانی کروٹیں بدل رہی تھی، جوانی شریر اور کافر جوانی!

اس نے چند بار کنکھیوں سے مجھے دیکھا، مجھے یقین ہے وہ میرے دل کی دھڑکنوں کو بھی سن رہی تھی روح اور احساس کے کانوں سے، یقیناً وہ بہت ہوشمند لڑکی تھی اُسے روح کی نباضی میں کمال حاصل تھا وہ عشق کی ان تھرتھراہٹوں کو فوراً اپنی نگاہوں میں جذب کر لیا کرتی تھی جو دلوں کی دھڑکنوں میں مل کر اس حادثہ کے پہلے ہی لمحہ میں فضا پر کیکپی بن کر چھا جایا کرتی ہیں،

قلی سامان اٹھا چکے تھے وہ بائیں ہاتھ میں اٹیچی کیس لئے آہستہ آہستہ جا رہی تھی جیسے زندگی کسی دم توڑتے ہوئے مریض کی طرف سے منہ موڑ کر جایا کرتی ہے لیکن میں کوئی بے عمل اور بے طاقت مریض تو نہ تھا کہ زندگی کی یہ متحرک روح دل سے نکل جاتی اور ہاتھ پاؤں نہ مارتا

میں بھی تو اپنے فرائض کی ادائیگی کے سلسلہ میں کچھ دیر پہلے کوئی فیصلہ کر چکا تھا۔

ارے ادھر لاؤ سامان شنکر اس ڈبہ میں رکھو!

یہاں زیادہ آرام ملے گا ——— میں نے قلی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

اس نے پھر مجھے دیکھا اسکی نگاہوں میں پذیرائی تھی اس کے سیاہ ریشمی بال کانوں پر اکھٹے ہو گئے تھے جیسے کوئی بڑا سیاہ کالا سانپ کنڈلی مار کر بیٹھ جاتا ہے۔ میں نے اشتیاق کی گرمی اور شدید پیاس کے ساتھ نگاہوں کا جواب نگاہوں سے دیا پیاسی اور تڑپتی ہوئی نگاہوں سے جیسے لڑتے وقت سپاہی جگر تلوار پر تلوار مار دیتا ہے وہ مسکرا کر سیٹوں کا جائزہ لینے میں مصروف ہو گئی میں فوراً ڈبہ میں گھس گیا اور ایک سیٹ کو جو کھڑکیوں سے الگ اور سونے کیلئے زیادہ موزوں تھی رومال سے صاف کرتے ہوئے بولا ، یہاں تشریف رکھئے یہ جگہ سونے کیلئے بہت اچھی ہے ،

وہ اندر آ گئی اور میری طرف غور سے دیکھتے ہوئے اپنے جسم کو زور سے سیٹ پر گرا دیا پھر ہنسکر بولی ، بہت اچھی جگہ ہے بابو شنکر یہ! اچھا اب آپ جا سکتے ہیں!

جی ہاں میں جا رہا ہوں لیکن مجھے کہیں جانا وانا نہیں ہے میں تو آپ کے ساتھ کانپور تک چلوں گا میں نے اپنے سفر کو بہت زیادہ

طویل بنانے کا ارادہ کرتے ہوئے کہا آپ ضرورت کے وقت مجھے یاد فرما سکتی ہیں،

شکریہ! لیکن صبح تک مجھے کوئی ضرورت نہ ہوگی اور دن نکلتے نکلتے میرا سفر ختم ہو جائیگا۔

پھر بھی میں آپ کے ساتھ ہوں آپ کہاں تشریف لئے جا رہی ہیں؟ میں نے کسی تعارف کا انتظار کئے بغیر کہا۔

کانپور ہی جاؤں گی۔

بہت خوب، تو میں آپ کے ساتھ چل رہا ہوں

میرے ساتھ کیوں یہ کہئے کہ گاڑی کے ساتھ!

جی ہاں بالکل یہی مگر بات یہ ہے کہ گاڑی بھی تو آپ ہی کے ساتھ جا رہی ہے میں نے ہلکا سا قہقہہ لگاتے ہوئے کہا اور کھڑکی میں سر ڈال کر پوچھا چائے منگوائی جائے آپ کے لئے؟

چائے تو نہیں البتہ ٹکٹ منگوا دیجئے اس نے جیب سے پرس نکالتے ہوئے کہا۔

بہت اچھا میں ابھی ٹکٹ لے کر آتا ہوں مگر واللہ اسکی ضرورت نہیں رہنے دیجئے روپیہ میرے پاس ہے!

آپ کی اتنی ہی عنایت کافی ہے کہ آپ نے مدراس سے یہاں تک کے سفر کا ٹکٹ مجھ سے نہیں مانگا ورنہ محصول ادا کرنے کے بعد میرے پاس کچھ بھی نہ بچتا۔

تو گویا آپ مدراس سے بے ٹکٹ آرہی ہیں خیر کوئی مضائقہ
نہیں میں ٹکٹ لاتا ہوں

یہ بات ہے تو ٹکٹ لکھنؤ تک لیجئے اور ایک ملازم کا بھی۔

مناسب ہے لیکن آپ تو کانپور تک جا رہی ہیں اور سروینٹ ؟

میں تو کانپور تک ہی جاؤنگی مگر وہاں بھی تو کسی حسین اور نوجوان
لڑکی کا مل جانا ممکن ہے آپ کو پھر ٹکٹ گھر تک دوڑنا پڑیگا۔
یہیں سے انتظام کر لینا اچھا ہے یقین رکھئے کانپور میں جو لڑکی سب
سے زیادہ خوبصورت ہوگی میں اُسے آپ کی طرف سے یہ ہدیہ پیش
کرونگی اگر ریلوے کے سب ملازمین آپ ہی کی طرح خلیق اور
منکسر المزاج ہوں تو کالجوں کی لڑکیاں ٹکٹ میں اپنا روپیہ ہی کیوں ضائع
کیا کریں اور ہاں آپ سروینٹ کے متعلق کچھ پوچھ رہے تھے بات
یہ ہے کہ میرے ساتھ کوئی ملازم تو ہے نہیں البتہ ایک غریب آدمی
بہت دور سے بے ٹکٹ آرہا ہے اور پچھلے اسٹیشنوں پر اُسے آپکے
بھائی بند کافی پریشان کر چکے ہیں میں اُسے کانپور تک آپکے ٹکٹ نمبر
سے لے جاؤنگی وہ حسین تو نہیں ہے لیکن غریب ضرور ہے اور غریب
میں کوئی حسن نہ سہی مگر ثواب میں تو ہے ——— اس نے آخری جملہ
میرے چہرے کو معنی خیز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے ادا کیا۔

میں نے ایک ٹکٹ سیکنڈ کلاس کا لکھنؤ تک خریدا ایک تھرڈ
کلاس کا کانپور تک لیا اور دونوں لاکر اُسے دیدیئے پھر ذرا ٹھہر کر

بولا، لائیے میں انھیں چیک تو کرلوں!

مجھے تو آپ چیک نہ کر سکے!

جی ہاں بعض اوقات ہمیں اس قسم کی غلطیاں دانستہ کرنی پڑتی ہیں؟

خدا کرے میرے بی، اے پاس کرنے تک آپ کا یہی اصول قائم رہے!

اس کی ہر بات سے میری جرأت میں اضافہ ہو رہا تھا وہ کچھ اس انداز سے ہنس ہنس کر گفتگو کر رہی تھی کہ بات بات پر میرا یہ یقین پختہ ہوتا جا رہا تھا کہ مجھے جس حادثہ کا انتظار تھا وہ اب وقوع پذیر ہونے ہی والا ہے

اپنا بستر تو کھول لیجئے!

میں کیونکر کھول سکوں گی مہربانی کر کے کسی قلی کو بلائیے۔

قلی قلی!! ——— شنکر، بھو، جمعدار!! میں زور زور سے چیخنے لگا اس نے کانوں پر ہاتھ رکھ لئے اور میں اپنی اس حالت پر کچھ جھینپ سا گیا لیکن قلی کی کیا ضرورت ہے میں کھولے دیتا ہوں میں نے ہولڈال کھول کر بستر بچھا دیا وہ میری بات پر صرف مسکرا دیا کرتی تھی لیکن اب غور سے مجھے دیکھ بھی رہی تھی ——— غالباً کوئی حادثہ رونما ہو چکا تھا! رومانی حادثہ!!

اچھا آپ بالکل جاگتے رہئے مجھے نیند آرہی ہے!

جی ہاں جا رہا ہوں اور تو کوئی کام نہیں؟
کام تو ایک اور یاد آ گیا اُس نے اپنے سینڈل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا یہ بہت میلا ہو گیا ہے لیکن اسوقت کوئی پالش کرنے والا مل سکے گا،
پالش کرنے والا تو مل جاتا مگر پالش کہیں قریب دستیاب نہ ہو گا۔
پالش تو میرے ساتھ ہے لیکن اب رہنے دیجئے اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے حسب معمول مسکرا کر کہا ——— میں اسے کبھی پسند نہ کروں گی!
میں بہت سٹ پٹایا نہ خود پالش کر سکتا تھا نہ کسی آدمی کو لا سکتا تھا میں نے بدحواسی کے عالم میں کہا میں کسی لڑکے کو بلائے لیتا ہوں!
لڑکے کو؟ ——— اس نے میری طرف ذرا غور سے دیکھتے ہوئے سوال کیا
جی ہاں ابھی لاتا ہوں ——— یہ کہتا ہوا میں جلدی جلدی ایک طرف کو چلنے لگا اور قریب سے ایک چائے والے کو پکڑ لایا لائیے اپنا جوتہ اور شیشی!
رہنے دیجئے صبح کو دیکھا جائے گا شیشی بہت دور ہے! اچھا شکریہ آپ تشریف لے جائیے۔ اس نے اکتا کر کہا یہ معلوم ہوا

کہ میں پالش کے سلسلہ میں تو کچھ دیر ٹھہر سکتا تھا لیکن بیکار ایک منٹ کے لئے بھی نہیں ٹھہر سکتا۔

میں اجازت چاہتا ہوں

خدا حافظ وہ جلدی سے لیٹ گئی اور میں نے دیکھا کہ اُس نے کمبل سے منہ ڈھانکنے میں ذرا عجلت سے کام لیا —— غالباً وہ سکون کے ساتھ اس حادثہ پر غور کرنے کا موقعہ ڈھونڈ رہی تھی۔ گاڑی چھوٹنے میں چند منٹ کی دیر تھی میں نے دو تین چکر اس ڈبے کے لگائے —— وہ بہت آزادی کے ساتھ لیٹی ہوئی تھی اب اس نے اپنا منہ اور سینہ کھول لیا تھا باریک ریشمی ساڑھی کے نیچے خوبصورت بلاؤز تھر تھرا رہا تھا میں نے قریب کھڑے ہو کر سگریٹ جلایا اور ایک بار پھر اسکی طرف دیکھا اس نے ساڑھی کا وہ حصہ جو سینہ کی اوٹ کئے ہوئے تھا الگ کر دیا اب خوبصورت بلاؤز اس کے مرمریں سینے سے چمٹا ہوا سسکیاں بھر رہا تھا۔ میرے دل کی دنیا زیر و زبر ہونے لگی۔

گاڑی نے سیٹی دی گارڈ نے جھنڈی ہلائی اور میں نے رومال ہوا میں لہرا کر اس سے رخصت طلب کی اس نے ایک حسین مسکراہٹ سے فضا کو جگمگا دیا گاڑی روانہ ہو گئی میں ایک تھرڈ کلاس کا گز پکڑ کر لٹک گیا اور اندر سے ٹکٹ دیکھنے لگا۔ یہ کام بہت جلد ختم ہو گیا مگر گاڑی جلدی ٹھہرنے والی نہ تھی سر جھکا کر کھڑکی کے پاس

آکھڑا ہوا بار بار جی چاہتا تھا زنجیر کھینچ لوں میرا دل دھڑک رہا تھا اب میں اپنی بزدلی پر افسوس کر رہا تھا مجھے اسی گاڑی میں بیٹھ جانا چاہیے تھا میں تو زنانہ ڈبے میں بھی تھوڑی بہت دیر بیٹھ سکتا ہوں پھر وہ کوئی پردہ دار لڑکی نہیں ہے،

وقت گذرتا گیا اور گاڑی ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر ٹھہری میں ٹہلتا ہوا اس کے قریب گیا مجھے یہ دیکھکر بڑی مسرت ہوئی کہ وہ بدستور جاگ رہی ہے اسکی آنکھوں میں نیند کا ذرا بھی اثر نہ تھا غالباً وہ مجھے تلاش کر رہی تھی آہ اسکی شربتی آنکھیں ——— مجھے دیکھتے ہی اسکی نگاہیں مسکراتی ہوئی محسوس ہونے لگیں جس طرف وہ لیٹی تھی پلیٹ فارم بھی اسی طرف تھا میں نے انجن پر منہ رکھکر پوچھا خیریت ہے؟

وہ اسٹیشن کا نام لے کر بولی خیریت نہیں ہے ایٹ ہے ایٹ!

اور یہ کہکر اس نے مسلسل ہنسنا شروع کر دیا میرے احساسات میں بجلیاں سی کوندنے لگیں لیکن میں یہ جرأت اب بھی نہ کر سکا کہ اسی ڈبہ میں جا بیٹھتا!

ہر اسٹیشن پر میں اترتا اور اسکی خیریت پوچھ لیتا وہ مسکراہٹوں سے میرا خیر مقدم کرتی کبھی میری طرف دیکھکر مسکراتی کبھی ٹہرے ہوئے بلاؤز کی طرف دیکھکر ہنس دیتی کبھی کہنیوں تک کھلے ہوئے ہاتھوں کو دیکھنے لگتی کبھی کوئی پر لطف بات کہدیتی میرے جذبات ریل کے کوئلہ کی طرح دہک رہے تھے اور دل اسٹیم انجن کی طرح دھک دھک

کر رہا تھا آخر ایک اسٹیشن پر جہاں ذرا دیر تک گاڑی ٹھرتی تھی میں اترا اور یہ سوچکر اترا کہ اب کے ضرور اس کے پاس جا بیٹھونگا وہ مجھے دیکھتے ہی مسکرائی میں قریب گیا اور آئینہ پر منہ رکھکر کھڑا ہو گیا اس نے آہستہ سے کچھ کہا جسے میں سن نہ سکا میں نے پوری کوشش کی کہ آئینہ سے ایک کان لگا دیا اور دیر تک اسی طرح کھڑا رہا وہ آہستہ آہستہ کچھ کہتی رہی اس کی پیشانی شکن آلود ہو گئی تھی غالباً وہ مجھ سے اپنی کسی بات کا جواب مانگ رہی تھی ایک مرتبہ زور سے کچھ بڑبڑا کر وہ لیٹ گئی میں نے منہ کے دونوں جانب ہاتھوں کی آڑ کر لی اور غور سے اسکی طرف دیکھکر کہا، اجازت ہو تو میں اندر آجاؤں؟

کیا کہا؟ —— وہ مسکرا کر بولی۔ اس کے رخساروں پر سرخی دوڑ گئی

پاس کی سیٹ خالی ہے ارشاد ہو تو میں اندر آجاؤں؟

ضرور، ضرور! مگر سنئے!

میں پھر اسی انداز سے کھڑا ہو گیا اس نے نہایت اطمینان سے داہنے پاؤں میں سینڈل پہنا، میلا بغیر پالش کا سینڈل، اور بہت زور سے شیشہ میں لات ماری —— بس نہ پوچھئے یہ معلوم ہوا کہ میں کسی خطرناک مورچہ پر کھڑا ہوں اور میرے قریب ہی کوئی بم پھٹ گیا ہے جس میں سے چاقو کے سے تیز دھار دار پھل نکل کر چہرے، پیشانی اور سر میں آ کر چبھ گئے تھے کانچ کا ایک ٹکڑا داہنی آنکھ سے کچھ اوپر ابرو اور پیشانی کے کنارے پر اس زور سے چبھ رہا تھا کہ میں آنکھ بھی نہ کھول سکتا تھا

زخموں سے خون بہ رہا تھا اور آنسوؤں کی بھٹی بیٹھی تانیں فضا میں تیر رہی تھیں، ٹھنڈی اور تاریک فضا میں جیسے دور کہیں پریاں اڑتی جا رہی ہوں گذشتہ ہفتہ میں میرا ایک دوست جو فوج میں کپتان تھا میدان جنگ سے واپس آیا تھا اس کے بھی اسی مقام پر بم کا ایک ٹکڑا لگا تھا دو تین مہینے کے بعد سے اسکی آنکھ چھوٹی ہونے لگی تھی اور اب بہت چھوٹی ہو گئی تھی وہ میرے ہی یہاں مقیم تھا میں سوچ رہا تھا میری آنکھ کا بھی یقیناً یہی حشر ہوگا لیکن یہ حادثہ آخر ہوا کیوں ؟

اس نے ٹوٹے ہوئے آئینہ سے سر نکال کر پوچھا، خیریت ہے ؟——
اطمینان رکھئے خون زیادہ نہیں نکلا، زخموں کی مرہم پٹی تو اب کانپور ہی میں ہو سکیگی اس وقت تو کوئی چیز ہے نہیں، کہئے تو پالش کی شیشی پیش کروں !

اب مجھے یقین ہو گیا تھا کہ اس نے دانستہ یہ شرارت کی ہے اسکی آواز مجھے بُری معلوم ہو رہی تھی اور صورت ؟———— میری دونوں آنکھیں بند تھیں اس کا چہرہ میں نہ دیکھ سکتا تھا اس کے الفاظ شعلوں کی طرح میرے کانوں میں داخل ہو رہے تھے اور احساس کو پھونکے ڈالتے تھے اس ذلیل عورت نے میری سخت توہین کی،——— بے شرم .. اور سنگدل عورت ! پاگل !!

اچھا آپ آرام سے کہیں جا کر بیٹھئے، آئس ونٹر اچھا رہیگا اطمینان سے برف کے ٹکڑے زخموں پر پھیرتے رہئے۔

بدقوارہ! ـــــــــ اور ناپاک عورت میں نے چپکے چپکے کئی بار یہ الفاظ دہرائے اور خون کے قطرے رومال میں جذب کرتا ہوا برف کی گاڑی میں جا بیٹھا ـــــــــ بعد کو معلوم ہوا وہ لکھنؤ کے ایک ڈپٹی کلکٹر کی لڑکی تھی اور مدراس اور بنگلور کے کسی انگریزی کالج میں پڑھتی تھی یہ بھی کہا گیا کہ اس کا دماغ صحیح نہیں ہے معلوم نہیں حقیقت کیا تھی! ـــــــــ ذلیل اور ناپاک عورت! ـــــــــ رومانی حادثہ!! کئی روز تک ان دونوں عنوانوں پر میں انگریزی میں خفا ہوتا ـــــــــ اور گالیاں بکتا رہا ـــــــــ

نوکرانی کا شب نامچہ

میں جوان تھی اور غریب بھی معلوم نہیں ان دونوں چیزوں میں سے کس چیز کو گناہ اور بدقسمتی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ میں تو سمجھتی ہوں دونوں چیزیں گناہ ہیں۔ خصوصاً جب ایک جگہ جمع ہو جائیں، ہاں تو میں جوان تھی اور غریب بھی، ایک چھوٹے سے گاؤں میں میں نے آنکھ کھولی پھر وہیں جوان ہو گئی، نمبردار کے گھر میں سب ہی مارتے پیٹتے تھے۔ پہلے پہلے تو میں سب کی مار کھاتی گئی لیکن آخر کار نمبردار کے لڑکے نے جو میرا ہم عمر تھا ایک دن میری طرف غور سے دیکھ کر بتا دیا کہ اب میرے دن مار کھانے کے نہیں رہے کچھ روز بار بار مسکرایا اور چند بار تنہائی میں مجھ سے بات چیت کرنے کا موقعہ بھی تلاش کیا

کیا، اس کا مطلب بالکل صاف تھا۔ میں اچھی طرح سمجھ گئی کہ جس گھر میں
لاتوں اور مکوں کی جگہ نگاہوں اور اشاروں سے میری تواضع کی جانے لگی
اب مجھے وہاں نہیں رہنا چاہیئے، یہ فیصلہ کر کے میں نے گاؤں چھوڑ دیا۔ اور
ایک اندھیری رات میں گاؤں کی ندی کو پار کر کے میں پہلی مرتبہ آزادی کی
وسیع اور ٹھنڈی فضا میں دوڑ رہی تھی۔ اس وقت کوئی میرا پیچھا نہیں
کر رہا تھا مگر نمبردار کا لڑکا! ——— جس نے ذرا سی دیر میں مجھے کچھ بنا دیا
تھا جوانی کی بے چینیوں کے ساتھ میرا تعاقب کر رہا تھا بلکہ وہ میرے ساتھ
ہی تھا، اس نے میری رگوں میں جو تڑپ پیدا کر دی تھی وہ اب بھی رگوں
کی اس تڑپ میں سمایا ہوا تھا مگر میں اس سے بچ کر بھاگ رہی تھی وہ نہایت
خطرناک لڑکا تھا، جادوگر اور خطرناک، اس کی آنکھوں سے مجھے ایک عجیب
قسم کا بھوت جھانکتا ہوا معلوم ہوتا تھا مجھے شہر کے ایک بہت
بڑے گھر میں برتن مانجھنے پر نوکر رکھ لیا گیا، اور اماں جی کے چند پرانے مگر دھلے
ہوئے کپڑے بھی مجھے دیدیئے گئے، گاؤں کے پھٹے پرانے چیتھڑے اتار کر
میں نے صاف کپڑے پہنے تو بڑے بھیا نے مجھے غور سے دیکھا، ان کی آنکھوں
سے وہی بھوت مجھے جھانک رہا تھا جو نمبردار کے لڑکے کی آنکھوں میں نظر
آیا تھا اور میں اب اس بھوت سے بہت ڈرنے لگی تھی، لیکن ایسا گھر ملنا بہت
دشوار تھا جہاں کوئی ایسا لڑکا موجود نہ ہو جس کی آنکھوں میں کوئی نہ کوئی بھوت
چھپا ہوا نہ بیٹھا ہو۔ میں نے سوچا اس سے بھاگ کر آخر جاؤں گی کہاں؟ جہاں
جاؤں گی میرے آگے یہ بھی جائے گا۔ میں باورچی خانے میں برتن مانجھ رہی

تھی بھیا اسکول کی چھٹی کے بعد سیدھے وہیں آگئے اور چولھے کے پاس آکر بولے، چائے تیار ہے؟ — مگر یہ دودھ تو بالکل ٹھنڈا ہوگیا ارے او دھر آ او گنوار دیکھ جلدی سے یہ دودھ تو گرم کردے!

ان کے لہجہ میں سختی تھی اور کچھ ترشی بھی، کیا نام ہے تیرا؟ یہ پوچھتے ہوئے وہ کچھ پگھل سے گئے۔ اب ان کی بات میں وہ سختی اور ترشی نہ تھی۔

شمسہ! میں نے دودھ کی دیگچی کو ایک میلے کپڑے سے پکڑ کر چولھے سے اتارتے ہوئے کہا۔

کہاں رہتی ہے؟

میرا گھر تو یہاں سے بہت دور ہے۔

بہت دور، یعنی اُفق سے بھی بہت دور، آسمان اور دھنک کمان کی رنگینیوں سے بھی دور مسکراتے ہوئے کہا۔ ان کی باتوں میں لوچ اور مٹھاس تھا۔

جی ہاں بہت دور ہے۔ میرا گھر!

اب اسی گھر کو اپنا سمجھو۔

یہ تو سمجھنا ہی پڑے گا۔

جان لو تھوڑی دیر کو میکہ سے سسرال میں آگئی ہو آخر سسرال بھی تو گھر سے بہت دور ہوا کرتی ہے۔ اُنھوں نے ہنسکر کہا۔

میں چپ ہوگئی، ان کی آنکھوں میں بھوت کی جگہ کوئی دیوتا آبیٹھا جو مجھے اپنی طرف بلانے کے لئے اشارے کر رہا تھا، نمبردار کا لڑکا میری آنکھوں میں پھرنے لگا۔ مگر بھوت اور دیوتا میں بڑا فرق ہے میں نے سوچا میں دیوتا

کو چھوڑ کر کبھی نہ بھاگوں گی۔

بھیا کا یہ معمول ہو گیا کہ جب گھر آتے باورچی خانہ کو ضرور جھانک لیتے اور میں کتنی ہی مصروف ہوتی آنکھیں مٹکا کر کہتے جاتے، اری شمسہ تو نے تو باورچی خانہ ہی کو گھر بنا لیا۔ کیا یہی ہے تیری سسرال؟ —— اور تیرا میاں؟ —— چولہا، چمٹا، توا! —— قہ قہ قہ وہ کھلکھلا کر ہنس پڑتے —— نہیں شمسہ چولہا تیرا میاں اور چمٹا توا جیٹھ اور دیور۔ دیگچی، ہنڈیا یہ سب تیری نندیں بھاوجیں کیوں ہے نا ٹھیک؟ —— اور آگ؟ بوڑھی ساس ناک چڑھی غصیلی ور ساس!

گھر بھر میں یہی ایک شخص تھے جو کبھی کبھی مجھ سے ہنس بول لیا کرتے تھے۔ اماں جی تو بغیر گالی گلوچ اور کوسنوں کے بات ہی نہ کرتی تھیں اور آپا ایسی تیز مزاج تھیں کہ توبہ ہی بھلی۔ روٹی پہ چتی نہ پڑتی یا کہیں سے ذرا کچی رہ جاتی تو اماں تو معاف بھی کر دیتیں مگر اس اللہ کی بندی کو ایک دو چٹکے بتائے بغیر چین نہ آتا تھا۔ پھر اللہ کے فضل سے وہ بارہ مہینے کی ٹھہریں بیمار، ان کے منہ میں چھالے ہوتے تھے اور جب سے گود آباد ہوئی تھی دن رات دست آتے رہتے تھے۔ پرہیز بہت سخت تھا۔ سالن میں ذرا نمک تیز ہوا اور انھوں نے ڈوئی یا کفگیر سنبھالی غصہ ہر وقت ناک پر دھرا رہتا تھا، ہنڈیا یا ڈوئی سے ذرا فرصت ملتی تو وہ بالشت بھر کا فتنہ میرے انتظار میں پھیل مچاتا رہتا تھا۔ سر پر سوار ہو جاتا اور اپنے سوکھے ہوئے بدن کی بساند سے دماغ سڑا دیتا۔ گھر کے سب چھوٹے بڑے آپا کے نخرے سہتے تھے۔ میاں کے گھر جاتی نہ تھیں جب دیکھو ہمارے ہی سینے بہانے نان کے توڑتے

سے لگی بیٹھی ہیں۔ دور دور کو چلی بھی جاتیں تو میاں کا ناک میں دم کر دیتیں تیسرے ہی دن وہ غریب ڈولی میں بٹھا کر چھوڑ جاتا۔ دوا لاتے لاتے وہ بھی تنگ آگیا تھا دس دس پھیرے حکیم کے گھر کے کرنے پڑتے پھر بھی بیوی اس پر برستی رہتی۔ یہ نہیں کیا وہ نہیں کیا۔ یہ نہیں لائے وہ نہیں لائے، آپ تو چاہتے ہی یہ ہیں میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جاؤں اور آپ کوئی نئی نویلی ——— خیر اس غریب کو تو گالی کوسنے کھانے کی کچھ عادت ہی پڑ گئی تھی، پھر اکثر اماں جی آڑے آجایا کرتی تھیں مگر مجھ بیکس کو چھوٹے پھکنی اور ڈوئی کی چوٹوں سے بچانے والا کوئی بھی نہ تھا۔ میں روٹی تو کھاتی دن میں دو ہی بار مگر آپا کی مار کھانی پڑتی چھ سات مرتبہ! ——— میں دیکھ رہی تھی بڑے بھیا کا دل میری مصیبتوں پر ضرور پسیج رہا تھا۔ آپا مجھے مارتیں تو ان کے تیوروں پر بل پڑ جاتے۔ منہ سے کچھ وہ بھی نہ کہہ سکتے تھے اور سچ تو یہ ہے میں بھی یہ ساری مصیبت اُن کی آنکھوں کے دیوتا ہی کے لئے بھگت رہی تھی، نہیں تو کبھی کی چلدی ہوتی۔

اسکول میں چار یا پانچ دن کی چھٹی ہوئی اور بڑے بھیا ماں باپ سے پوچھ بندوق اُٹھا شکار کو چل دیئے۔ میں نے جلدی جلدی ناشتہ پکا کر ساتھ کیا۔ چلتے چلتے بولے، شمسہ دیکھ دعا کرنا بہت سا شکار ملے!

ملے گا بھیا ضرور ملے گا۔

ہاں شگون تو اچھا ہے ——— ہم دونوں بھی تو زخمی ہیں کیوں شمسہ؟

دوسرے دن گیارہ بجے رات کو بھیا لوٹ کر آئے ایک ہرن اور چار تیتر مار کر لائے تھے، بہت خوش تھے باچھیں کھلی جا رہی تھیں، گھر کے سب آدمی لیٹ

چکے تھے سردیوں میں اتنی رات تک کون جاگتا بھلا اُن کے لئے ایک میں ہی تھی کہ چولھے کے انگارے کرید کرید کر جاڑے کا مقابلہ کر رہی تھی اور بھیّا کا راستہ دیکھ رہی تھی، بھیّا نے جھوٹ نہیں کہا تھا واقعی ہم دونوں زخمی تھے۔

بھیّا کچھ لائے بھی؟

اماں ایک ہرن اور چار تیتر! بھیّا سینہ تان کر بولے۔

سب نے موٹے موٹے لحافوں سے منہ نکال کر خوشی کے نعرے بلند کئے ——

بھگنا مجھے دینا بھیّا ہرن کا! چھوٹے بھیا نے بہتی ہوئی ناک کو آستین کی رگڑ سے پونچھتے ہوئے کہا۔

ایک ہرن اور چار تیتر بس؟ آپا ریشمی لحاف سے دبی دبی بولیں جیسے ان کے نزدیک یہ کچھ تھا ہی نہیں، اچھا تیتر میرے لئے رکھ دینا، شمسہ سمجھ گئی میں آبجوش بیوں گی صبح ناشتہ میں، آپا اس انداز سے بولیں جیسے کوئی مرتے وقت وصیت کیا کرتا ہے۔ اور اُسے یہ اطمینان نہیں ہوتا کہ لوگ اسے پورا بھی کردیں گے۔

میں نے بھیّا کو چائے پلائی .... وہ چائے پیتے پیتے بولے، ارے میں کھانا بھی تو کھاؤں گا شمسہ ایک تیتر میرے لئے ابھی پکا دو مسلّم سمجھیں باقی آپا کے لئے رکھ چھوڑو۔ دیکھو میں کہانی کہتا ہوں تم تیتر پکاؤ!

میں نے جلدی جلدی مصالحہ پیسا سب چیزیں موجود تھیں، دیگچی بجھی ہوئی چولھے کی باڑ پر ٹکی ہوئی تھی، تھوڑا سا گھی بھی ایک کٹوری میں ٹھنڈا ہوا رکھا ہوا تھا۔ چھوٹی سی ایک ارنڈ کگڑی بھی پڑی تھی۔

بارہ بجے گھر بھر میں سناٹا سا چھا گیا۔ کبھی کبھی کمرے کے اندر سے خراٹوں

کی آوازیں آجاتی تھیں جیسے کہیں دور بلبلیاں لڑ رہی ہوں ـــــ بھیا کے کمرے کی ہلکی ہلکی روشنی آئینوں سے چھن چھن کر صحن میں لوٹ رہی تھی روشنی کی کرنوں کے ساتھ ان کی آنکھوں کا دیوتا بھی کھیلتا ہوا معلوم ہو رہا تھا میں بستر کو چھوتی جاتی اور دل میں کچھ ٹیس سی محسوس کرتی جاتی، بھیا آہستہ آہستہ کچھ گنگنا رہے تھے میرے کان اُدھر ہی لگے ہوئے تھے۔

میں بستر کو چوکور سا لحد لگا چکی تھی اور یہ ارادہ کر رہی تھی کہ دیگچی میں ٹل کر آٹے سے منہ بند کر دوں اور چولھے سے لکڑیاں نہ کھینچ کر کھٹولے پر جا پڑوں، ٹوٹا ہوا کھٹولا لکڑی کے دھوئیں میں اٹے ہوئے جالوں کے سایہ میں پڑا مجھے گھور رہا تھا۔ میری آنکھیں کھٹولے پر اور کان بھیا کی میٹھی میٹھی تانوں پر لگے ہوئے تھے وہ ہلکی اور دھیمی آوازیں گا رہے تھے ؎

اک ہوک سی دل میں اٹھتی ہے اک درد سا دل میں ہوتا ہے

میں رات کو رویا کرتا ہوں جب سارا عالم سوتا ہے

رفتہ رفتہ گنگناہٹ باورچی خانہ کے قریب ہوتی گئی بالآخر بھیا دبے پاؤں باورچی خانہ میں داخل ہوئے، قمیص کے بٹن کھلے ہوئے تھے۔ سر کے بال بے ترتیبی سے بکھرے ہوئے تھے۔ ایک ہاتھ میں کتاب تھی دوسرے میں پنسل، چہرہ تمتمایا ہوا تھا آنکھیں پھٹی پھٹی سی تھیں، اور وہ دیوتا جو روز مجھے ان کی آنکھوں سے جھانکا کرتا تھا اس وقت ان میں نہ تھا بلکہ وہی بھوت بیٹھا مسکرا رہا تھا جو نمبردار کے لڑکے کی آنکھوں میں مجھے نظر آیا تھا، کیا یہاں سے بھی مجھے بھاگنا پڑے گا لیکن کوئی نہ کوئی لڑکا تو ہر گھر میں ہوتا ہے۔

شمسہ کہو کھانا تیار ہے؟

آٹا گوندھا رکھا ہے بس تیتر کو پتیلی میں ڈال کر منہ بند کیا اور اُسے انگاروں پر ڈال کر توا رکھا اور چپاتی پکانی شروع کر دی۔

تمہیں بہت بھوک لگی ہے شمسہ!

ضرور لگی ہو گی بھیا دن بھر کے بھوکے ہو!

نہیں عمر بھر کا!

خیر آپ ماں کے پیٹ ہی سے بھوکے پیدا ہوئے ہوں گے مگر آدھ گھنٹہ اور صبر کیجئے۔

مجھ سے صبر نہیں ہوتا شمسہ وہ انگڑائی لے کر بولے۔ ان کی آنکھوں میں سرخی تھی اور چہرے سے وحشت ٹپک رہی تھی۔

پھر کچا آٹا اور یہ تیتر حاضر ہے!

شمسہ! شمسہ! وہ کچھ کہتے کہتے رک گئے۔ میرا دل دھڑکنے لگا۔

شمسہ آٹا اور تیتر کچا سہی۔ مگر میرے دل میں محبت کی ہنڈیا اُبل رہی ہے وہ پک چکی ہے

محبت کی ہنڈیا ـــــ میرے پیٹ میں اس لفظ کو سن کر کھدبدی سی اٹھ گئی۔

یہ کیا چیز ہوتی ہے بھیا؟

میں تمہیں یہی بتانے تو آیا ہوں، اچھا ادھر آؤ۔ انہوں نے لالٹین کی بتی کم کرتے ہوئے کہا۔

بھیا ـــــ میرے منہ سے اور کچھ نہ نکل سکا۔ انھوں نے اپنا ایک ہاتھ میرے منہ پر رکھ دیا۔

تین بج چکے تھے، میں چولھے کی راکھ کو کرید رہی تھی، راکھ ٹھنڈی ہو چکی تھی انگارے بجھ گئے تھے، میری آنکھوں سے آنسو اُبل رہے تھے دنیا ایک سرے سے دوسرے کونے تک میری نگاہ میں تاریک ہو گئی تھی اور میں ان بھیانک دھندلکوں میں کچھ ڈھونڈتی پھر رہی تھی، ـــــ صبح تک یوں ہی بیٹھی نصیبوں کو روتی رہی، ـــــ ہرن مرا ہوا ہرن میرے سامنے پڑا تھا۔ اس کے زخم سوکھ گئے تھے، تیتر بھی مرنے کے بعد سردی میں اکڑ چکے تھے۔ ان کے زخموں کا لہو بھی خشک ہو گیا تھا مگر میں تڑپ رہی تھی میرے زخم ہرے تھے ان سے خون رس رہا تھا۔ میں سوچ رہی تھی عمر بھر میں یوں ہی تڑپوں گی اسی طرح میرے زخم رستے رہیں گے۔ شکاری کئی قسم کی گولیاں چلاتا ہے!

سویرے ہی میاں نے گھنٹی بجا کر گرم پانی مانگا۔ میں لوٹے میں پانی لے کر گئی بار بار جی میں آیا جو کچھ گذرا ہے سب ان سے کہہ دوں ہونٹ ہلے زبان میں جنبش ہوئی مگر مجھے محسوس ہوا بھیا نے دوڑ کر میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ خوشامدانہ لہجہ میں کہہ رہے ہیں۔

شمسہ عورت نے ہمیشہ پریم کی لاج رکھی ہے، بس جیسے میرے ہونٹوں کو سی دیا گیا ہو۔

کیا مارا بھیا نے شمسہ؟

ایک ہرن ـــــ چار تیتر اور ـــــ! میں چپ ہو گئی!

صبح کو منہ دھونے سے پہلے سب نے بھیا کے شکار کو دیکھا ہرن کی کھال کو ٹٹول ٹٹول کر چھرے نکالے۔ مگر میرے زخموں پر کسی نے پھایا نہ رکھا۔

اسی روز سے بڑے بھیا ــــــ نہیں نہیں شوکت میاں، اب میں انھیں بھیا کیوں کہوں؟ ــــ مگر سب کے سامنے صبح سے شام تک بیسیوں مرتبہ مجھے اسی نام سے ان کو پکارنا پڑتا تھا ــــ ہاں تو وہ میرے ساتھ کافی اخلاق اور توجہ سے پیش آنے لگے۔ آپا کبھی مارنے کو اٹھتیں تو وہ ان کا ہاتھ پکڑ کر کہتے آپا کسی بیکس کو مارنے سے کیا فائدہ؟ دو چار مرتبہ یہ اتفاق پیش آیا تو آپا اصل واقعہ کو بھانپ گئیں۔ انھوں نے اماں جی کے کان بھی بھر دیئے۔ اب دن رات وہ یہی رٹ لگاتی رہتیں شمسہ کا رنگ روپ تو خوب نکھرتا جاتا ہے وہ کپڑوں سے تو نوکرانی معلوم ہوتی ہے، مگر ناک نقشہ سے اچھی خاصی ملکہ نظر آتی ہے ــــ وہ اماں کو سنا کر بھی کہتی اور بھیا کو بھی، بھیا جل بھن جاتے اور ناک بھوں چڑھا کر کہتے آپا میرے سامنے ایسی باتیں نہ کیا کرو، مگر اماں یہ سنکر کچھ سوچنے لگتیں، تھوڑے ہی دنوں میں یہ طے ہو گیا کہ بڑے بھیا کلکتہ پہنچکر نوکری کر لیں، دو سال سے انٹرنس میں فیل ہو رہے ہیں اب وہ پڑھ نہیں سکتے۔ کلکتہ میں ان کے چچا کاروبار کیا کرتے تھے اس تصفیہ کے بعد بھیا چپ چاپ رہنے لگے ان میں گھن سا لگ گیا، کلکتہ جانے سے دو چار دن پہلے پھر دو تیتر مار لائے اور بولے شمسہ پکاؤ میرے لئے ابھی۔

نہیں میں تیتر کبھی نہیں پکاؤں گی!

شمسہ دیکھو میں کلکتہ جارہا ہوں۔ ایک دفعہ اور اپنے ہاتھ کا پکا ہوا تیتر کھلا دو۔ ہرگز نہیں بھیا ایسا کبھی نہیں ہو سکتا، میں نے جھنجلا کر کہا! اور میں رونے لگی، اماں بھی نماز کی چوکی پر بیٹھی یہ باتیں سن رہی تھیں، چیخ کر بولیں کیا ہے شمسہ؟

اماں میں ایک تیتر ابھی پکوانا چاہتا ہوں اور یہ برابر انکار کر رہی ہے وہ جلدی سے بول اٹھے۔

پکا کیوں نہیں دیتی، کم بخت نخرے کیوں کرتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے روٹیاں لگ گئی ہیں! تجھے؟

اب تو پکانا ہی پڑے گا شمسہ لو اماں بھی کہہ رہی ہیں انہوں نے طنزیہ کہا، میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے، مگر رات کو اوس برستی ہے تو اسے کون دیکھتا ہے

میں لالٹین کی مدھم ہوتی روشنی میں باورچی خانہ میں بیٹھ کر تیتروں کے پر نوچنے لگی، لوٹا ہوا کھٹولا لکڑی کے دھوئیں سے اٹے ہوئے جالوں کے سایوں بڑا سے مجھے گھور رہا تھا۔ بھیا کے کمرے کی ہلکی ہلکی روشنی آنکھوں سے چھن چھن کر صحن میں لوٹ رہی تھی، اور وہ کچھ گا رہے تھے، اس منحوس رات کے سارے واقعات میری آنکھوں میں پھر رہے تھے اور میں محسوس کر رہی تھی۔ بھیا پھر اسی انداز سے باورچی خانہ میں آ رہے ہیں اور آتے ہی انہوں نے ——

ایک دم سے میں نے دیکھا زمین گھومنے لگی۔ باورچی خانہ اور اسکی تمام چیزیں، دیگچیاں، رکابیاں، چولہا، توا، چمٹا، میرے جھینٹھ دیوار و فرش سبھی چیزیں سب ناچ رہی تھیں اور جیسے گھماتے کہاتے اب یہ گرنے ہی والی تھیں۔ میرا جی گھٹ

رہا تھا میں محسوس کر رہی تھی کھانا پکانے، برتن مانجھنے مصالحہ پیسنے اور تیز بنانے کی ساری دلچسپیاں اب فنا ہو چکی ہیں، ——— اور میں مرنے ہی والی ہوں گرمی اور دھوئیں میں میرا دم گھٹ جائیگا میں مر جاؤں گی ایسی بزدلی کے ساتھ مصالحہ بھون رہی تھی، ننھی ننھی آوازوں سے باورچی خانہ میں ——— یا صرف میرے کانوں میں ایک راگ سا بہتا پھر رہا تھا، دھوئیں کی گھٹن اور آگ کی گرمی سے میں اکتا رہی تھی۔

بھیا کلکتہ چلے گئے اور ان کی آنکھوں کا بھوت میری رگوں میں سما گیا اور آہستہ آہستہ بڑھتا گیا۔

آپا نے ایک دن خفا ہو کر مجھے گھر سے نکال دیا، ان کی خفگی کا راز میں جانتی تھی۔ جس روز مجھے نکالا گیا اسی دن سرائے کی ایک اندھیری کوٹھری میں چند ہلکی ہلکی چیخیں گونجیں اور میرے خیال میں غائب ہو گئیں ——— میرا تصور اب بھی باورچی خانہ میں تھا۔ کلکتہ کی گاڑی چھوٹ رہی تھی ریل کی جھک جھک آہستہ آہستہ اُفق کے اُس پار پہنچکر صبح کی سفیدی ہی میں غائب ہوتی جا رہی تھی، باورچی خانہ کے روشن دان سے سورج کی کرنیں داخل ہو رہی تھیں اور چھوٹے چھوٹے ذروں کو اچھال اچھال کر کھیل رہی تھیں ——— مگر یہ تو سرائے کی ایک تنگ اور نمناک کوٹھری تھی، یہاں کوئی ٹوٹا ہوا کھٹولا تھا نہ دھوئیں میں اٹے ہوئے لکڑی کے جالے تھے ٹاٹ کے ایک ٹکڑے پر کوئی نرم سی چیز پڑی سانس لے رہی تھی، معلوم نہیں کہ بھیا کی آنکھوں والا بھوت تھا یا دیوتا!

سال ڈیڑھ سال کے بعد بڑے بھیا کلکتہ سے واپس آئے ان کے ساتھ ایک گوری چٹی عورت تھی، اور میری گود میں ایک ننھی سی بیمار بچی! اب میں ایک اور جگہ نوکر تھی، پریم کی لاج کے ٹانکے اب بھی میرے ہونٹوں میں لگے ہوئے تھے آج تک کسی کو معلوم نہ تھا کہ باسی ٹکڑے چوس کر بیمار پڑ جانے والی پیلے گالوں کی یہ پیٹ بڑھی ہوئی تلی، دبلی بچی جس پر دن بھر مکھیاں بھنکتی رہتی ہیں کس کی ہے؟

ایک دن موقعہ پا کر میں نے انھیں گلی میں روک کر دور سے بچی کو دکھایا وہ دس روپیہ کا ایک نوٹ زمین پر ڈال کر جلدی سے آگے بڑھ گئے۔ ان کی آنکھوں میں مسکراہٹ نہ تھی نفرت اور احتیاط جھلک رہی تھی میں نے حقارت سے اس کاغذ کے ٹکڑے کو دیکھا اور بچی کو اچھی طرح گود میں کھینچ کر بولی، باپ ذلت کے ساتھ تجھے صرف کاغذ کا یہ پرزہ دے سکتا ہے لیکن ماں! ——— وہ اپنی زندگی اور زندگی کی ساری خوشیاں تجھ پر نثار کر سکتی ہے۔ تیرا بھنکتا ہوا چہرہ اس کی نگاہوں میں مہکتا ہوا پھول ہے——— پریم کی لاج کے ٹانکے اب بھی نہ ٹوٹے تھے، میرے ہونٹ بدستور سلے ہوئے تھے!

لیڈر کا شب نامچہ

۱۲ بجے رات کو جلسہ گاہ سے واپس ہوا، چاند کی چودھویں تاریخ تھی ہر طرف روشنی ہی روشنی تھی ٹھنڈی اور دلچسپ روشنی، ایک

نوجوان جس سے میں بالکل ناواقف تھا موٹر میں میرے ساتھ تھا کالے رنگ
کی موٹر نکھری ہوئی چاندنی کے خاموش سمندر میں گرد کی ہلکی سی لہر پیدا
کرتی ہوئی اس طرح دوڑ رہی تھی جیسے دل کی پاکیزگی میں گناہ کا تصور
کبھی کبھی دوڑنے لگتا ہے اور روح پر ایک غبار سا چھا جاتا ہے نوجوان
راستہ بھر میری آتش بیانی کی تعریفیں کرتا رہا اس کا بیان تھا کہ
شہر میں آج تک کوئی ایسا مقرر نہیں آیا عام طور پر میری تقریر کا نہایت
گہرا اثر ہوا ہے اور جب میں بولنے کھڑا ہوتا ہوں مجمع پر ایک خاص کیفیت
طاری ہو جاتی ہے میری تقریر میں مذہبی روح زیادہ ہوتی ہے، یہی وجہ
ہے کہ میرا ہر لفظ بجلی بنکر دلوں پر گرتا ہے اور تخیلات کی گہرائی میں سما
جاتا ہے وہ موٹر چلا رہا تھا اور بار بار کنکھیوں سے مجھے دیکھتا جا رہا تھا
میں سمجھ رہا تھا کہ اسکی تعریف میں ذرا بھی مبالغہ نہیں ہے وہ بالکل سچ
کہ رہا ہے، ایک خاص قسم کا نشہ کانوں کے ذریعہ جسم میں داخل ہو کر
میرے دل و دماغ کو بیخود بنا رہا تھا سینہ آہستہ آہستہ پھول رہا تھا
جیسے اسمیں کوئی چیز بھری جا رہی ہو میں اپنی سیاہ رنگ کی گھنی داڑھی
پر ہاتھ پھیر رہا تھا جو میری رائے میں میرے گورے چٹے چہرے پر بہت
اچھی معلوم ہوا کرتی تھی خصوصاً جب میرے سر پر گہرے عنابی رنگ کی
ترکی ٹوپی بھی ہوتی تھی، میں نے اسے کوئی جواب نہ دیا لیکن اسکی
رائے کے صحیح ہونے میں مجھے ذرا بھی شبہ نہ تھا، ہلکی ہلکی مسکراہٹ
سے گویا میں روح کی آواز سے کہ رہا تھا آداب عرض! ——— اب

کا حسن سماعت ہے!

موٹر ایک سیدھی سڑک پر دوڑ رہی تھی چاندنی کھیتوں، باغوں اور کھلے ہوئے میدانوں میں قہقہے لگاتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی اونچے اونچے پہاڑ سوتے ہوئے پیڑوں کو سروں پر اٹھائے ساتھ ساتھ دوڑ رہے تھے کبھی کبھی کوئی پیڑ جمائی لیتی ہوئی آنکھوں سے ہمیں دیکھنے لگتا تھا رات کا یہ دلچسپ منظر جذبات میں گدگدی پیدا کر رہا تھا، ٹھنڈے اور برف کی طرح جمے ہوئے جذبات میں!

کئی روز سے شہر میں پر تکلف دعوتیں ہو رہی تھیں اس وقت کچھ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ مرغ اور انڈوں کی آمیزش سے بدن میں ایسا لطیف اور گرم خون پیدا ہو گیا ہے کہ رگیں پھولتی جا رہی ہیں، اعصاب [illegible] ایک شباب انگیز عجلت کیساتھ امنگوں کی تخلیق میں مصروف ہیں، جوانی آنکھوں سے ابل رہی ہے شباب دل میں انگڑائیاں لے رہا ہے میں سوچ رہا تھا میری قیام گاہ کوئی اچھی اور دلچسپ جگہ نہیں ہے وہاں کسی قسم کی رنگینی نہیں نہ دلچسپی اور زندگی کے آثار نظر آتے ہیں، جہاں صنفی جذبات میں سوئیاں چبھونے والا حسن نہ ہو وہاں زندگی اور رنگینی کیونکر ہو سکتی ہے، کھانا ضرور اچھا مل جاتا ہے لیکن جب اچھا کھانا ہی چوبیس گھنٹہ کے بعد رگوں میں خون کی جگہ شراب بھر دے اور رگوں کو تڑپا کر زندگی مانگنے لگے تو آخر اس کا یہ مطالبہ بھی تو پورا ہونا چاہئے لمبی داڑھی والا منیجر جو صبح و شام دونوں وقت اپنی اٹھی ہوئی داڑھی

سے میری داڑھی کے تقدس کا جواب دیتا رہے اور میلے بدبودار کپڑے
پہننے والا ایک ناسمجھ خدمتگار چند قدم کے فاصلہ ہی سے پسینہ کی
سڑاہند سے اپنے آنے کا اعلان کرے کسی ہوٹل کی کامیابی کیلئے
ضروری ہو تو ہو مسافروں کے آرام و راحت کو گوشت و پوست کے
ان بے حس مجسموں سے کوئی تعلق نہیں، ـــــــ موٹر ہوٹل کے دروازے
پر رک گئی خیالات کا دھارا کبھی مدہم پڑ گیا جسطرح پانی کی لہریں بند
کی دیوار سے ٹکرا کر رک جاتی ہیں، سامنے ہی میرا کمرہ تھا بجلی کی روشنی
آئینوں سے چھن چھن کر باہر آرہی تھی، ہلکی اور بے نور روشنی ـــــ
پھر سڑک پر لوٹ کر دم توڑ دیتی تھی، میں اتر پڑا نوجوان سے ہاتھ
ملایا اور مسکراتا ہوا اپنے کمرے کی طرف چلا جو روشن ہونے کے
باوجود اندھیری قبر کی طرح مجھے گھور رہا تھا نیچے ایک ٹوٹی سی کھاٹ
پر میلا تکیہ سر کے نیچے رکھے خراٹوں کی بھیانک آواز سے تھکے ماندے
مسافروں کی میٹھی نیند میں خلل ڈالنے کی سرگرم کوشش میں مصروف
تھا قریب ہی خدمتگار اپنی میلی نیم آستین کے پورے بٹن کھولے سیمنٹ
کے ٹھنڈے چبوترے پر ہاتھ پر سر رکھے غالباً کوئی ڈراؤنا خواب
دیکھ رہا تھا گہرے سانس کی مسلسل جنبشوں سے اس کا سینہ دھونکنی
بنا ہوا تھا اور لمبی لمبی مونچھیں کھجور کے پتوں کی طرح ہل رہی تھیں میں
اوپر کی منزل میں جانیکے لئے زینہ پر قدم رکھنے کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ
ایک اجنبی آدمی جلدی جلدی میری طرف بڑھتا ہوا معلوم ہوا ـــ

اس کے منہ پر داڑھی نہ تھی مگر زندگی اور رنگینی تھی میرے پیچھے پیچھے وہ اوپر آگیا میں نے کمرہ کھولا، بغیر سلوٹوں کا نرم بستر جس پر سفید چادر بچھی ہوئی تھی نیند کے سہانے پیام سنا رہا تھا، جماہی کے لئے منہ کھولتا ہوا میں مسہری پر بیٹھ گیا اور جیب سے دستی نکال کر اس پانی کو پونچھنے لگا جو آنکھوں میں بھر گیا تھا ۔۔۔۔ میں نے دیکھا سیاہ رنگت کا ایک آدمی میرے سامنے کھڑا تھا اسکی بڑی بڑی مونچھیں منیجر کی ڈاڑھی سے زیادہ روشن تھیں وہ جلدی سے بولا تنہا آپ ہی ہیں اس کمرے میں ؟

اس نے کچھ اس انداز سے یہ سوال کیا تھا کہ میرے سارے جسم میں ایک سنسنی سی دوڑ گئی اور ہاتھ پیروں میں چیونٹیاں سی رینگنے لگیں میں سمجھ گیا وہ مجھ سے کیوں یہ سوال کر رہا ہے۔

ہاں ابھی تو تنہا ہی ہوں میں نے اسکی طرف متوجہ ہو کر کہا
کیا کسی کو بلایا ہے؟

بلاتا کس کو؟

اسی کو جس کے لئے رات بنائی گئی ہے ۔۔۔۔ اور جس کے لئے یہ چاند اور تارے جگمگا رہے ہیں اس نے برجستہ کہا اور بالکل شاعرانہ انداز سے

رات کس کے لئے بنائی گئی ہے؟ ۔۔۔۔ میں نے ایک ناسمجھ طالب علم کی طرح پوچھا۔

آپ کیسے ہیں! ـــــــ اس نے ہلکا سا قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

نہیں بھائی میں تو خود رات کیلئے بنا ہوں!

آدھی رات تو آپ نہ معلوم کہاں گنوا آئے، اور کہتے ہیں رات کیلئے بنا ہوں کہئے تو لاؤں رات کی دیوی کو؟

رات کی دیوی کو؟ ـــــــ میں نے بھرے ہوئے پیٹ سے ایک گہرا سانس لیتے ہوئے پوچھا

جی ہاں رات کی دیوی کو!

میں کچھ سوچنے لگا پھر بہت احتیاط کیساتھ بولا منیجر مجھے جانتا ہے!

پھر ایسی جگہ چلئے جہاں کوئی آپ کو نہ جانتا ہو

ایسی کوئی جگہ میرے علم میں نہیں

میں لئے چلتا ہوں میرے ساتھ چلیے۔

میں نے جوتوں کے بند جو باتیں کرتے کرتے کھول ڈالے تھے پھر باندھ لئے، جیب سے بٹوا نکال کر دیکھا اس وقت کتنے نوٹ ہیں اس میں، پھر کمرہ بند کیا اور اپنے نئے رہنما کے ساتھ چل دیا ـــــــ

تنگ ناہموار اور اندھیری گلیوں میں جوتوں کی آہٹ سے رات کے سکوت کو جھنجوڑتا ہوا میں اس کے پیچھے بھاگ رہا تھا میرا سانس تیز ہو گیا تھا اور پیشانی پر پسینہ کی نمی محسوس ہونے لگی تھی وہ مجھے ایسی جگہ لئے جا رہا تھا جہاں کوئی مجھے نہ جانتا ہو یقیناً اس کے ذہن میں کوئی ایسی جگہ تھی اور ضرور تھی لیکن کیا وہاں پہنچکر

میں بھی اپنے آپ کو بھول جاؤں گا؟ اگر نہیں تو پھر ایسی جگہ کی تلاش سے فائدہ؟ جب تک میں خود اپنے کو جانتا ہوں اس وقت تک دوسروں کی عدم واقفیت میری سیاہ کاری پر کیونکر پردہ ڈال سکتی ہے میں چلتے چلتے سوچ رہا تھا اور جلدی جلدی اپنے آپ کو بھی بھلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے اپنی مذہبی اور اصلاحی تقریروں کو بھلا دیا۔ میں لوگوں کے اُن آنسوؤں کو بھی بھول گیا جو میری تقریر کے دوران میں ان کی آنکھوں سے جاری ہو جایا کرتے تھے اور ان کے قہقہے بھی میرے حافظہ سے محو ہو گئے، تحسین و آفرین کے پرجوش نعروں کی گونج بھی میری قوت سامعہ میں باقی نہ رہی۔

——— لیکن لمبی اور سیاہ داڑھی جو میرے چہرے کی وجاہت میں اضافہ کر رہی تھی کسی طرح نہ بھلائی جا سکی اور گہرے عنابی رنگ کی ٹوپی بس ایک چیز یاد بھی رہ جائے تو کیا ہرج ہے؟ ——— گلیوں کی تاریکی میں بھٹکتے ہوئے ہم دونوں چوڑی سڑک کے موڑ پر پہنچ کر ایک دومنزلہ عمارت کے نیچے ٹھہر گئے جس کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور اس پر ایک تختہ تعارف بھی لگا ہوا تھا جس پر متعدد زبانوں میں ہوٹل کا نام لکھا ہوا تھا وہ تیزی سے زینہ پر چڑھنے لگا میں نے بھی اس کا ساتھ دیا اور ایک برآمدہ میں جہاں گوشت اور مچھلیوں کے دھوؤں کی بد پھیلی ہوئی تھی چند آدمی بے خبر پڑے سو رہے تھے ان کی میلی دھوتیاں سمٹتے سمٹتے رانوں تک آ گئی تھیں، اس نے ایک شخص کو جھنجھوڑ کر پوچھا، کوئی کمرہ خالی

کتنی دیر کو چاہیے؟ اس نے انگڑائی لیتے ہوئے ناک کے نتھنوں کو پھلا کر پوچھا

یہی دو تین گھنٹے کو! اس نے بالوں سے بھری ہوئی بغل میں ہاتھ ڈال کر کھجاتے ہوئے کہا

(نمبر ۲ لو روف) میں چلے جاؤ —— کرایہ چوبیس گھنٹہ کا لگیگا

اس نے ناک مٹکتے ہوئے اچھی طرح ہوش میں آ کر کہا سن لیا؟

سن لیا!

پھر کھول لو دروازہ کنڈی چڑھی ہے باہر سے

وہ مجھے کمرے میں بٹھا کر چلا گیا اور تقریباً آدھے گھنٹے میں بہت خوش خوش واپس آیا اور اندر جھانک کر بولا بلا لوں؟

ہاں —— ہاں لے آؤ

ایک عورت سفید برقعہ اوڑھے، گہرے سرخ رنگ کا نیا سینڈل پہنے، ہرے موزے چڑھائے میرے سامنے کھڑی تھی —— میں مڑ مڑ کر آئینہ میں اپنی صورت دیکھ رہا تھا بھرا بھرا ہوا پرگوشت اور وجیہہ چہرہ جذبات کی شدت سے دمک رہا تھا آنکھیں چڑھی ہوئی تھیں اور ڈاڑھی جسے پوری کوشش کے باوجود میں اب تک کھلا نہ سکا تھا آج سے زیادہ کبھی میرے منہ پر بھلی نہ معلوم ہوئی تھی میری نگاہیں احساس کا مرکز بنتی جا رہی تھیں، شفاف

آئینہ اور چمکتا ہوا نیا سُرخ سینڈل بس یہی دو چیزیں میرے احساسات میں ناچ رہی تھیں اور ہاں کبھی کبھی گہرے عنابی رنگ کی ٹوپی بھی سیاہ پھندنے کی بے تکی جنبشوں کے ساتھ ہنستی ہوئی نگاہوں کو اپنی بے کیفیوں میں الجھا لیتی تھی مگر یہ سب تو بھول جانے والی چیزیں تھیں، وہ ابھی تک ہینڈ ہٹ پکڑے کھڑا تھا اب مجھے ایک قہقہہ کے ساتھ اپنی طرف متوجہ کر کے بولا، میں جا رہا ہوں دروازہ بند کر لو بہتیر ہے، دو گھنٹہ کے بعد آؤنگا!

میں نے کمرہ بند کر لیا ایک اجنبی عورت رات کی تنہائی اور بھڑکتی ہوئی جنسی بھوک کی پوری شدت کے وقت میرے سامنے کھڑی گہرے گہرے سانس لے رہی تھی میرا دل دھڑک رہا تھا سر بھاری ہوتا جا رہا تھا آنکھیں جل رہی تھیں رگیں اینٹھنے لگی تھیں کمرے میں چیونٹیاں سی رینگ رہی تھیں،

بیٹھئے نا!

بیٹھنے ہی کیلئے آئی ہوں

آواز میں لوچ کے ساتھ رس اور مٹھاس بھی تھا۔

تو پھر تشریف رکھئے! میں نے برقعہ سے ڈھکا ہوا اس کا نرم اور گداز بازو تھام کر کہا،

اس نے مسہری پر اپنے آپ کو دھم سے بلکہ چھم سے گرا دیا، برقعہ کے بٹن کھول دیئے گئے تھے بھرے ہوئے سینہ پر کسے ہوئے بلاؤز کے نیچے دھڑکن محسوس ہو رہی تھی، بلاؤز کی بے ترتیب حرکتیں دل کی اضطرابی

بلکہ خفقانی دھڑکنوں کا ساتھ دے رہی تھیں آزادی سے بیٹھئے! میں نے دستانوں سے ڈھکے ہوئے ہاتھ کو دباتے ہوئے کہا۔

پہلے آزادی تو دلا دیجئے! اس نے نہایت شوخی سے کہا

آزادی نہ مل جاتی تو آپ کا یہاں تک آنا ممکن نہ تھا

اگر اسی آزادی کیلئے آپ بھرے ہوئے جلسوں میں دھواں دھار تقریریں کرتے ہیں تو کسی دن آپ کی ماں بہنوں کو بھی میرے نقش قدم پر چلنا ہوگا اور اگر اس برقعہ کے اندر —— ایک بند کمرے میں بھی آپ مجھے آزاد خیال کرتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ زنجیروں میں بندھا ہوا ایک قیدی بھی آزاد ہے، ہندوستان کیلئے اِسی قسم کی آزادی آپ کے ذہن میں ہو گی؟

کیا آپ مجھے جانتی ہیں؟ —— میں نے روح کی گہرائیوں میں اس کے چبھتے ہوئے فقروں کی خلش کو نہایت شدت کیسا محسوس کرتے ہوئے چونک کر پوچھا اب مجھے اس سے بات کرتے ہوئے ڈر معلوم ہو رہا تھا وہ بہت کافی پڑھی لکھی عورت تھی اور میں جتنا تعلیم یافتہ عورت سے ڈرتا تھا دنیا میں کسی چیز سے اتنا خائف نہ تھا میری رائے میں میعاد پر پھٹنے والے بم اور تعلیم یافتہ عورت کا ایک ہی مفہوم تھا، پھر وہ مجھے جانتی تھی، میرا نام بھی یقیناً اُسے معلوم ہو گا اور یہ تھی، لیکن یہ وقت دامن بچانے کا نہ تھا نہ خوف سے کانپ اُٹھنے کا، آخر بموں کی بارش میں تو لوگ اپنے فرائض ادا کرتے ہیں —— انسانی فرائض بھی اور شیطانی

بھی، بھیر ایک تعلیم یافتہ عورت کے سامنے گڑگڑا نے کے کیا معنی ؟ جوانی کا دیوتا میری رگوں میں جذبات گھونٹتا ہوا دوڑ رہا تھا اس نے مجھے کافی دلیر بنا دیا تھا، یہی دلیری ہاتھ میں پہونچکر حرکت میں تبدیل ہو گئی اور میں نے برقعہ کو جھٹکا دیکر کہا، بند کمرے کے اندر برقعہ میں لپٹ کر بیٹھنا وچھو میں لحاف اوڑھنے کے برابر ہے ——— پھینکئے بھی اسے میں نے پھر برقعہ کو کھینچکر کہا، ——— برقعہ اس کے منہ سے ہٹ گیا، ایک مکروہ اور بھیانک چہرہ جس کی گہری سیاہی پاوڈر کی سفیدی کے نیچے جھلک رہی تھی میری نگاہوں کے سامنے تھا چھوٹی چھوٹی آنکھیں جو اُتری ہوئی ندی کی طرح جوانی کے جوش سے خالی تھیں جیسے جذبات کا کوئی بلبلا کبھی ان میں پیدا ہی نہ ہوا تھا، پلکوں سے ڈھکی ہوئی پیروں پر جھکتی جارہی تھیں موٹے موٹے بھدے ہونٹ جنکی ساخت میں سرخی کی جگہ سیاہی بلکہ نیلاہٹ پوری جہالت کے ساتھ صرف کیگئی تھی اور جن پر جوانی کے مٹھاس کی جگہ بڑھاپے کا پھیکاپن دوڑ رہا تھا ایک دوسرے سے ملے ہوئے تھے، دونوں ہونٹوں کے بیچ میں پان کی سُرخی اس طرح جھلک رہی تھی جیسے چونہ پیسنے کی چکی میں ابھی ابھی کُٹی ہوئی اینٹیں پیسی گئی ہیں۔

میں نے مڑکر پھر آئینہ دیکھا۔ اب میری ڈاڑھی کے گھنے سائے میں جوانی کا دیوتا اونگھتا ہوا معلوم ہو رہا تھا اور گہرے عنابی رنگ کی ٹوپی پر انسانیت کے دھندلے نقوش ابھرتے جا رہے تھے، آہستہ آہستہ میں اپنے آپ کو پہچاننے کی قابل ہو رہا تھا ——— میں لیڈر ہوں، جس

سینوں میں آگ لگا دینے والا شعلہ مقال مقرر! ——— میری نگاہیں
کمرے کی زنجیر پر جمی ہوئی تھیں، میں نے سوچا مجھے دروازہ کھول کر یہاں
سے بھاگ جانا چاہیے میں اُٹھا اور تیزی سے دروازے کی طرف چلا
اس نے شیروانی کے دامن کو پکڑ کر زور سے جھٹکا دیا اور آنکھوں کی ایک
طنزیہ گردش سے کچھ مبہم سا مطالبہ کیا، میں نے فوراً جیب سے بٹوہ نکال کر
پانچ روپیہ کا ایک نوٹ اُسے دے دیا، اُس نے برقعہ اُوڑھ لیا میں ابھی دروازہ
نہ کھول سکا تھا کہ باہر سے کسی نے زور سے کواڑوں میں دھکا دیتے ہوئے
حاکمانہ لہجہ میں کہا دروازہ کھولو!

آواز میں کرختگی تھی اور حکومت کی سختی، میں سہم گیا، اب میرے بدن
میں کسی مقام پر سنسنی نہ تھی نہ کہیں چیونٹیاں رینگ رہی تھیں البتہ بالکل غیر
محسوس راستوں سے جان نکلتی ہوئی معلوم ہو رہی تھی، دل کی حرکت بالکل مدہم،
ہو گئی تھی اور خون کی روانی تو محسوس ہی نہ ہوتی تھی، میں کانپ رہا تھا عورت،
جس کے گالوں کی مرجھائی ہوئی کھال میرے دل سے زندگی جذب کر رہی تھی وہ زیر
لب مسکرا رہی تھی جیسے تڑپتے ہوئے شکار کو آہستہ آہستہ ٹھنڈا ہوتے دیکھ کر شکاری
مسکرایا کرتا ہے، حقیقت میں شکاری کی حیثیت اسی کی تھی میری نہ تھی

جلدی کھولو! ——— کسی نے بہت زور سے دروازے پر لکڑی
مار کر کہا میں نے جلدی سے زنجیر کھول دی کواڑ ایک شدید جھٹکے سے
کھل گئے اور دو طاقتور نوجوان میرے قریب آ کھڑے ہوئے ایک نے
عورت کی طرف اشارہ کرکے پوچھا یہ کون ہے؟

میں نے کانپتی ہوئی آواز میں جواب دیا مجھے نہیں معلوم کون ہے؟ — آپ کو نہیں معلوم کون ہے؟ اس وقت تو آپ ہر چیز کو بھولے ہوئے ہیں یہ کیوں یہاں لائی گئی تھی؟
رات کے وقت تنہائی میں کسی عورت کو بلانے کا صرف ایک ہی مقصد ہو سکتا ہے۔
یہ جواب آپ کا بہت ہی معقول ہے اچھا تو چلئے تھانہ میں!
تھانہ میں! — کیوں؟ میں سر سے پیر تک کانپ رہا تھا
یہ تو وہیں پہونچکر معلوم ہوگا۔
اب میں واقعی لیڈر تھا مجھے معلوم ہو رہا تھا ایک بہت بڑے مجمع میں کھڑا ہوں، میرے ہاتھ پاؤں کانپ رہے ہیں، منہ سے ایک لفظ بھی ادا نہیں ہوتا سر سے پیر تک پسینہ میں ڈوب گیا ہوں لوگ نہایت نفرت اور حقارت سے مجھے دیکھ رہے ہیں بعض میرے چہرہ کی ساخت پر معترض ہیں بعض گھنی اور لمبی ڈاڑھی پر بعض مطالبہ کر رہے ہیں، اس جھوٹے اور مکار لیڈر کو اسٹیج سے دھکیل دیا جائے، بے غیرت جاہل کہیں کا یہ ذلت اور توہین میرے لئے موت کا پیغام تھی میری لیڈری دم توڑ رہی تھی، تقریر کی گرمی سردی میں بدل چکی تھی اور خود میرے ضمیر کی آوازیں لوگوں کے قہقہوں میں ملکر مجھے ملامت کر رہی تھیں۔
خدا کے لئے مجھے تھانہ میں نہ لے چلئے۔ میں نے عاجزی کے ساتھ

کہا اب میں آئینہ کی طرف دیکھتے ہوئے شرما رہا تھا میں نہ چاہتا تھا آئینہ میرے ان جذبات شرم و ندامت کو نمایاں کرے جو پہلی مرتبہ میرے دل و دماغ میں پیدا ہو رہے تھے۔

پھر کہاں چلنا چاہتے ہیں آپ؟

مجھے قیام گاہ پر جانے دیجئے!

یہ کیونکر ہو سکتا ہے؟ جیل کی کوٹھری کے بدلہ آپ گھر مانگتے ہیں اتنی رعایت تو عدالت بھی آپ ایسے جرائم پیشہ بزرگوں کیساتھ نہیں کر سکتی وہ بھی زیادہ سے زیادہ بی کلاس دے سکتی ہے اور آپ چاہتے ہیں غیر مشروط رہائی یعنی اے کلاس بھی نہیں، یہ نہیں ہو سکتا اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر سخت لہجہ میں کہا آپ کو تھانہ چلنا ہو گا!

میں نے سر جھکا کر فرمانبرداری اور اطاعت مندانہ عاجزی کیساتھ اپنی مجبوری ظاہر کی، عورت کے ہلکے ہلکے قہقہے میرے کانوں کے پردوں کو مجروح کرتے ہوئے باہر کی کھلی فضا میں تحلیل ہوتے جا رہے تھے اور میرے کالے کلوٹے رہنما کی شرارت آمیز مسکراہٹیں ان کا استقبال کر رہی تھیں وہ ایک کھمبے کی اوٹ میں کھڑا تماشا دیکھ رہا تھا جیسے کوئی سنگدل دشمن اپنے حریف کو زہر کا پیالہ پلانے کے بعد اُسے ایڑیاں رگڑتے ہوئے دیکھا کرتا ہے، عورت کی میں نے توہین کی تھی اُسے قابلِ التفات نہ سمجھا تھا پہلے ٹھوکریں مار مار کر اس کی سوئی ہوئی بلکہ مردہ امنگوں کو بیدار کیا پھر نفرت کیساتھ منہ پھیر لیا اس سے

بڑی سی توہین ایک عورت کی اور کیا ہو سکتی ہے، عورت اس نوع کی تحقیر سے دوچار ہو کر ہمیشہ ناگن بن جاتی ہے مگر اس کم بخت کالے ناگ کے تو میں نے کوئی چوٹ نہ لگائی تھی اس پر تو پورا اعتماد کیا تھا پھر وہ کیوں مسکرا رہا تھا، اسکی مسکراہٹیں نشتر بن کر میری روح میں تیر رہی تھیں،

اس وقت میری عزت خطرے میں تھی بلکہ سچ پوچھئے تو عزت باقی ہی نہ رہی تھی اب میں اپنے جھوٹے اور مصنوعی وقار کی خاطر تھانہ جانے سے گریز کر رہا تھا، میں اسکی مونچھوں کو حقارت کیساتھ دیکھ رہا تھا مجھے انکی گھری سیاہی میں شیطان مسکراتا ہوا نظر آ رہا تھا ——— مگر اسکی مونچھوں کے شیطان کی مسکراہٹوں میں میں نے اپنی ڈاڑھی کے نشیمن میں رہنے والے فرشتوں کی آوازوں کو بھی نظر انداز کر دیا تھا مونچھوں کے شیطان اور ڈاڑھی کے فرشتوں کی اس فیصلہ کن جنگ میں شیطان کی کھلی ہوئی مدد کر چکا تھا۔ فرشتے کیونکر انتقام لئے بغیر چھوڑ سکتے تھے۔

سوچنے میں وقت ضایع کرنیکی اجازت نہیں دی جا سکتی آپ کو فوراً روانہ ہو جانا چاہئے اس نے میرے داہنے بازو پر بید کی ہلکی سی ضرب لگاتے ہوئے کہا۔

آپ مجھے یہیں مار ڈالئے میں تھانے نہیں جاؤنگا۔

پھر میں ٹیلیفون دیکر تھانہ سے مدد طلب کرتا ہوں۔

نہیں نہیں خدا کے لئے ایسا نہ کیجئے یہاں کے تمام معززین سب مجھے جانتے ہیں،

یہ غلط ہے یہاں کے معزز اس وقت آپ کو پہچانینگے جب اصل صورت میں آپ ان کے سامنے آئیں گے اُس وقت وہ بہت قریب سے آپ کا حقیقی رنگ۔ روپ دیکھیں گے —— اور فرض کیجیے یہاں کے لوگ آپ کو جانتے بھی ہیں تو بھی آپ کا جرم محض اُن کے جاننے سے ہلکا نہیں ہو سکتا۔

خدا کے لئے مجھے اس حادثہ سے بچائیے!

اس کے لئے آپ کو معقول معاوضہ دینا ہوگا

جو آپ فرمائیں گے میں پیش کر دوں گا۔ میں نے خوشی سے اچھل کر کہا جیسے کسی نے مجھے ڈوبتے وقت سہارا دیا ہو۔

اچھا تین سو روپئے نکالئے!

تین سو؟ میں نے ذرا اضطراب کیساتھ پوچھا میری جیب میں اس وقت دو سو کے نوٹ تھے اور آمد و رفت کے مصارف آج ہی ارباب جلسہ نے میری نذر کئے تھے اسی میں ہوٹل کا کرایہ بھی شامل تھا۔ اتنا روپیہ تو اس وقت میرے پاس نہیں ہے۔

پھر اُدھار نہیں کیا جا سکتا

سو روپئے قبول کیجئے

ہرگز نہیں۔

بڑی مشکل سے ڈیڑھ سو روپئے پر معاملہ طے ہوا دس روپئے اس کی محنت نکال لے رہنما کو الگ دینے پڑے میرے پاس گھر تک پہونچنے کیلئے

صرف چالیس روپئے بچے دن نکلنے سے پہلے ہی میں نے منیجر کو جگا کر اس کا بل ادا کیا اور تھرڈ کلاس میں بیٹھکر چپکے سے روانہ ہو گیا لیکن مصیبت یہ تھی کہ مجھے جاننے والے ہر جگہ موجود تھے ایک صاحب نے مجھے تھرڈ کلاس میں دیکھکر تعجب سے پوچھا، حضرت یہ تھرڈ کلاس میں آپ کیوں آئے؟ --- مصارف تو آپ کو سیکنڈ کلاس کے دیئے گئے تھے

جلدی میں یہیں بیٹھ گیا میں نے ندامت کے ساتھ کہا

اتنی ہی جلدی تھی تو فرسٹ کلاس میں بیٹھتے اپنے مرتبہ سے تنزل کیوں کیا آپ نے؟

بھائی دنیا تنزل کی طرف جا رہی ہے میں نے جلدی سے کہا اور رات کے بھیانک واقعات میری نگاہوں میں پھرنے لگے —— واقعی دنیا تنزل کی طرف جا رہی تھی اور میں تو اس راستہ کو بہت دور تک طے کر چکا تھا، جن لوگوں نے اگلے دن مجھے کھانے پر مدعو کیا تھا گھر پہنچکر اُن کے "تار وصول ہوئے —— اس واقعہ کے بعد بھی میرا پیشہ چلتا رہا داڑھی بڑھتی رہی تقریر مقبول ہوتی رہی اور شہرت بھی ہر طرف پھیلتی رہی، سچ ہے قدرت بڑی پردہ پوش ہے ایسا نہ ہوتا تو رات بنائی ہی کیوں جاتی چوبیس گھنٹے دن ہی نہ رہا کرتا!

دولتمند کا شب نامچہ

میں شہر کا بہت دولتمند آدمی ہوں قومی کاموں میں دل کھول کر چندہ دیتا ہوں ہر قسم کی تقریبات میں میری شرکت لازمی ہے بڑے بڑے جلسوں کی صدارت اکثر میرے ہی حصہ میں آتی ہے اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ میں کچھ زیادہ پڑھا لکھا آدمی ہوں بلکہ صرف یہ ہے کہ میری جیب سے عقلمندوں کو کافی فائدہ پہونچ سکتا ہے شہرت اور تعریف کو میں بچپن ہی سے بہت زیادہ پسند کرتا ہوں بعض لوگ تعریف کو کانوں کی زندگی کہتے ہیں لیکن میں اس مٹھاس کو روح کی غذا سے تعبیر کرتا ہوں کسی کے منہ سے اپنی برائی سن کر مجھے جس قدر صدمہ ہوتا ہے اتنا کسی بات سے نہیں ہوتا ہزاروں روپے کا نقصان بھی میرے دل کو ملول نہیں کر سکتا لیکن ذرا سی برائی یا نکتہ چینی مجھے پاگل اور مجنون بنا دیتی ہے کوئی جھوٹ موٹ ہی مجھ سے کہدے کہ فلاں شخص آپ کی نسبت کہہ رہا تھا کہ وہ نہایت بخیل اور روکھے آدمی ہیں بس اتنی سی بات مجھے گھنٹوں الجھن اور بے چینی میں مبتلا رکھیگی میرا دماغ یہ سوچتے سوچتے جنوں کی سرحد تک پہونچ جائیگا کہ آخر میں نے کون سا ایسا کام کیا جو بخل اور روکھے پن کے ذیل میں آتا ہے کسی قومی کام میں چندہ نہیں دیا یا کسی دعوت میں کسی مضمون نگار، اخبار نویس، شاعر یا لیڈر کو نہیں بلایا کسی ایڈیٹر کے نذرانہ میں کمی کی، کسی مشہور لیڈر کو بغیر رسید لئے چندہ دینے سے انکار کردیا آخر کیا قصور ہوا مجھ سے؟ اس کے بعد سیکڑوں میری یہ

یہ کیفیت ہو گئی کہ جب چندے کی کوئی فہرست سامنے آ گئی، میں کوشش کیا کرتا کہ زیادہ سے زیادہ رقم فہرست پر میرے نام کے آگے درج ہو اور لوگ مجھے سخی، ایثار پیشہ اور قوم پرست سمجھتے کیونکہ یہ اخبارات میں، جب کوئی اپیل شایع ہو گئی میں اس چندہ کا اعلان سب سے پہلے نمایاں طریقہ پر کراؤں گا میرے انہیں اوصاف کی بنا پر شہر کے ہر طبقہ اور خیال کے لوگ مجھے پسند کرتے ہیں لیکن میری بیوی!

——— وہ بیوی جو دو بیویوں کی قسمت بازی کے بعد حاصل ہوئی ہے!

بات یہ ہے کہ امارت کی سہولتوں سے عام طور پر دولتمند جو فائدے اٹھایا کرتے ہیں میں بھی بعض اوقات وہ فائدہ حاصل کرنے کی کوشش کیا کرتا ہوں یہ کاروائی نہایت راز میں ہوتی ہے گھر سے دراز اور تاریک راتیں ہیں۔

——— اسی تاریک رات کی روشن صبح کو میں کسی نہ کسی جلسہ کا صدر ہوتا ہوں یا کسی قومی کام میں فراخدلی سے شریک ہو جاتا ہوں اور میرے اوصاف جمیلہ کا تذکرہ ہر مخلص کارکن کی زبان پر ہوتا ہے حالانکہ دل کی ہر دھڑکن روح کیلئے ایک ناقابل برداشت چوٹ ہوتی ہے۔

میرا ایک ملازم ہے نہایت معتمد اور وفادار ——— کالے خاں!

درحقیقت یہ میری امیرانہ خباثتوں کا ڈھلا ہوا غلاف ہے یا چمکتا ہوا ملمع! جس کے نیچے میری بڑی بڑی سیاہ کاریاں دفن ہیں۔

بیگم سے جب طبیعت اکتا گئی یا نیت بھر گئی اور جذبات کا ذائقہ تبدیل کرنیکی ضرورت ہوئی تو میں نے پھر انہیں رنگینیوں میں گم ہو جانے کی کوشش کی جو دوسری بیوی کے مر جانے کے بعد اور تیسری شادی سے قبل مجھے

حاصل تھیں نہایت دلچسپ رنگینیاں یا بہت رنگین دلچسپیاں جو کالے خاں کی کوششوں سے رات کی تنہائیوں میں نصیب ہو جایا کرتی تھیں اور میری شہرت پا سا کھ پران سے کوئی بڑا اثر نہ پڑتا تھا رات بھر کے لئے ابھرے ہوئے رخساروں والی کوئی حسینہ حسن کے سیلاب شباب کی قیامتیں نمایاں ہوتیں کسی گراں قیمت پر خریدی جاتی اور صبح کی نور افشاں فضا پر پھیلنے سے قبل ہی اُسے رخصت کر دیا جاتا۔

چھ سات مہینے تک میں نے ویران اور سادہ زندگی بسر کرنے کے بعد کالے خاں کی وفاداری سے فائدہ اٹھانے کا قصد کیا ــــ اور اس نے بڑی مشکل سے صرف میری خاطر بڑھاپے میں توبہ توڑی میری نشست کا کمرہ عرصہ تک تاریک رہنے کے بعد حسن کی شعاعوں سے جگمگا اُٹھا میں اپنی تیسری بیوی سے بہت ڈرتا تھا پہلے پہلے تو اُن کے حسن سے متاثر رہا پھر ان کی جوانی نے مجھے مرعوب رکھا اور اب؟

اب تو میں صرف ان کے رونے پیٹنے، بکنے جھکنے یا روٹھ کر میکے چلے جانے کی جاہلانہ حرکت کے سوا اور کسی چیز سے ڈرتا ہی نہ تھا عورت کا حسن ویسے ہی ناپائیدار ہوتا ہے پھر میں نے تو ہمیشہ اُسے کافی ناپائیدار خیال کیا تھا اور جوانی؟ ــــ میری رائے میں عورت سال ڈیڑھ سال سے زیادہ کسی مرد کی نگاہ میں جوان رہے تو اُس مرد ہی کو بوڑھا سمجھنا چاہئے بوڑھا اور جذبات سے عاری، جنسی بھوک اور جنسی خواہشات سے محروم، بھونرا ایک ہی پھول پر جم کر بیٹھ جائے تو کون نہ ہے عقل

کھے گا کہ وہ اپنی فطرت پر قائم ہے نئے پھولوں کا رس چوسنا، اور تازہ کلیوں پر بیتابی کے ساتھ منڈلانا ہی بھونرے کی فطرت ہے۔ پھر میری شادی کو اس سے کچھ زیادہ زمانہ ہی گذر چکا تھا اب میری بیوی نہ حسین رہی تھی نہ جوان وہ ایک ایسا پھول تھی جو رس نکل جانے کے بعد کھلا رہتا ہے اور کونپلوں سے اپنی شگفتگی کی داد لیتا رہتا ہے ایسے خشک اور نکہت سے محروم پھولوں کے قریب بھونرا اپنی مست اور جوان گنگناہٹیں لٹاتا رہے تو اسے اندھا اور بے حس ہی کہنا پڑیگا بہر حال میں اندھا اور بے حس نہ تھا اور نہایت اہتمام کے ساتھ نئے پھولوں کا جائزہ لینے میں مصروف تھا کالے خاں ایک ماہر اور تجربہ کار شکاری کی حیثیت سے نئے پھندے بناتا اور اچھے اچھے شکار پھانسنے میں مصروف رہتا تھا ایک دن اس نے رازداری کے مخصوص لہجہ میں کہا، اطلاع ہے کہ ایک نہایت حسین عورت محلہ میں کہیں باہر سے آئی ہے، اس کو آپ کی حسن پرستی کے افسانے سنائے جا رہے ہیں بہت ممکن ہے کہ کھچڑی جلد پک جائے اور دس پانچ دن کے اندر ہی صحن چمن میں آزاد پھرنے والی یہ شوخ تتلی آپ کی سفید مچھر دانی میں پھڑکتی نظر آئے۔

میں سچ سچ بتائے دیتا ہوں کہ صحیح خواہش جس چیز کا نام ہے اور جسے صرف روح کی خاموش انگڑائی کہہ سکتے ہیں اس سے میرا دل خالی تھا چالیس کے بعد روح کو انگڑائی یا جمائی لینے کی ضرورت ہی کب پیش آیا کرتی ہے، یہ تو سب خمار کی علامات ہیں اور چالیس کے بعد روح میں کوئی

سرشاری یا بدستی باقی ہی نہیں رہتی لیکن کالی خاں کی اس اطلاع نے میرے دل کی گہرائیوں کو جذبات کی شدت سے الٹ پلٹ کر دیا اور یہ معلوم ہوا کہ سوکھے ہوئے دریا میں ایک دم باڑھ آگئی میں بے چین ہو گیا اور آپ ہی آپ یہ محسوس ہونے لگا کہ میرا دل کسی طرف کھینچ رہا ہے اور اس کیفیت میں آوازیں بھی ہیں اور بے چینیاں بھی، اضطراب بھی ہے اور سرمستیاں بھی کوئی قوت ہے جو اُسے جذب کر رہی ہے کسی نا معلوم سمت سے روح پر چنگاریاں سی برستی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں جو احساس سے جھٹ کر رہ جاتی تھیں میں نے کالے خاں سے کئی بار کہا بھائی تمہارا ہدیہ اب تک پیش نہیں ہوا کب تک انتظار کراؤ گے؟

کالے خاں بولا سرکار جانور بڑا جوکنا ہے جتنے داؤں یاد تھے سب چوک گئے!

پھر کیا مطلب ہے؟ میں نے کرب و اضطراب کے گہرے احساس کے ساتھ تیوری پر بل ڈال کر کہا اب اُمید نہ رکھنی چاہیئے؟

آثار تو ایسے ہی دکھائی دیتے ہیں

کالے خاں! —— میں نے اشتیاق پر ایک چوٹ اور گہرا زخم لگنے کی سی تکلیف کے ساتھ کہا تم جانتے ہو میں اس معاملے میں روپے پیسے کی کبھی پرواہ نہیں کیا کرتا پھر مایوس ہونے کی کیا وجہ ہے تمہارے منہ سے ایسی باتیں سنکر میں خود نادم ہوں نہ معلوم تمہارے نام کی غیرت کیا ہوئی کالے خاں ڈوب مرو تم چلو بھر پانی میں بڑھاپے میں شاید تمہاری عقل نے جواب دیدیا، سرکار اس نے کہنا شروع کیا ذرا سی غلطی

ہیں بدنامی کا اندیشہ ہے پردہ نشین اور شریف گھرانے کی عورت ہے
روپے پیسے کا لالچ اس پر کیا اثر کرے گا البتہ محبت کا جال بن رہا ہوں
شاید یہ سونے کی چڑیا پھنس جائے محبت کا جال کیونکر؟
اس کو بتایا جا رہا ہے کہ ہمارے سرکار بڑے وجیہہ بڑے خوبصورت
اور نیک ——— وہ ہیں!
قہ قہ قہ ——— میرے منہ سے بے اختیار قہقہہ نکل گیا اور ایسا
معلوم ہوا کہ دل بہت بڑا ہو گیا مگر روح کے شعلے اور بھڑک اٹھے جیسے دہکتی
ہوئی آگ پر تیل چھڑک دیا جاتا ہے۔
جلدی کرو کالے خاں جلدی!
صبر کیجئے حضور ہم اپنی طرف سے تو دیر کرتے رہے، مگر یہ کام
ہی کچھ ایسا ہے کہ اسمیں دیر سویر کا کوئی سوال ہی نہیں،
کئی دن کے بعد کالے خاں نے کہا آدھی کامیابی تو ہو گئی!
میں نے خوشی سے اچھل کر پوچھا کیا ہوا صاف کہو۔
سرکار اس پر راضی کر لیا کہ وہ یہاں تک آجائے مگر بات یہ ہے
کہ شریف عورت ہے آج تک گھر سے پاؤں نہیں نکالا شرم کی تو بس دیوی
ہے کہتی ہے کمرے میں بالکل اندھیرا ہو!
اندھیرا؟ میں نے ہنسکر کہا چاند نکلے اور اندھیرا رہے یہ کیونکر ممکن
ہے کالے خاں مگر میں سمجھ گیا چراغ تلے اندھیرا ہی رہنا چاہئے کا خیال
ہمیں یہ شرط منظور ہے بات یہ ہے کہ جب شرم ٹوٹ جائے گی تو یہ شرط

آپ ہی آپ اُٹھ جائینگی اچھا پھر میں کیا دوں تمہیں ؟ —— لو سو روپے کا ایک نوٹ رکھ لو۔

ایک پیسہ نہیں سرکار اس نے ایک آنکھ بند کرتے ہوئے کہا۔

اچھا یہ بات ہے میں نے خوش ہو کر کہا اور فوراً میرا دل دھڑکنے لگا قریب تھا کہ سینہ پھٹ جائے بڑی مشکل سے جذبات کی رو کو قابو میں کیا اور اُٹھ کر ٹہلنے لگا۔

پھر آج تیار رہئے آپ کا لیکخاں نے چلتے چلتے پھر کہا۔

میں تو نہ معلوم کب سے تیار ہوں!

نشست کا کمرہ خوب آراستہ کر دیا گیا بجلی ۱۰ بجے قطعاً گُل کر دی گئی اور میں آرام کرسی پر لیٹا حقہ پیتا رہا کبھی کبھی دل بے قابو ہو جاتا تو کوئی شعر گنگنانے لگتا حقے کی گڑگڑاہٹ اس کے خوشبودار دھوئیں میں ملکر کانوں سے ٹکراتی پھر شعر کے الفاظ اندھیری فضا کی ہلکی لہروں پر بہتے ہوئے آتے اور یہ سب چیزیں مل جل کر روح میں سما جاتیں، بارہ بج گئے راستہ دیکھتے دیکھتے آنکھیں پتھرا گئیں نہ کمبخت کا لیکخاں آیا نہ کوئی اور بیٹھے بیٹھے طبیعت اُلجھنے لگی ساڑھے بارہ بجتے ہی کچھ آہٹ سی ہوئی اور میرا دل اس طرح اچھلنے لگا جیسے زخمی پرند پھڑپھڑانے لگتا ہے کمرہ میں آہستہ سے کسی نے پاؤں رکھا اور میں سراپا شوق بن کر ایک جگہ کھڑا ہو گیا،

میاں ؟ —— ایک باریک سا پہچانا ہوا آواز آیا یہ اندھیرا

کیوں ہے کھڑے ہیں ؟

چل بے مردود تو اس وقت یہاں کیوں آیا ؟ —— میں نے بیگم کے منہ چڑھے ملازم کو جس کی حیثیت میری نگاہ میں ہمیشہ سے پانچویں دستہ کی بھی ڈانٹ کر کہا وہ بولا پان لایا ہوں آپ کے لئے اور بیگم صاحبہ انتظار کر رہی ہیں آپ کا کھانے میں۔

کہدے میں کھانا نہیں کھاؤں گا اس وقت اور دیکھ بھئی کہہ دینا ابے سن اُلو کے بچے —— کہدینا کہ آپ آرام کریں میں الکشن کے جھگڑے میں الجھا ہوا ہوں کچھ آدمی آنے والے ہیں، دروازہ بھیڑ لینا !

اندھیرے میں الکشن ہو رہا ہے ! —— وہ ہنسی کی ہلکی ہلکی آوازیں پیدا کرتا ہوا چلا گیا میرے خیالات کا سلسلہ جو اس کے آنے سے کچے سوت کی طرح ٹوٹ گیا تھا پھر قائم ہو گیا میں تصورات کے گہرے سمندر میں غوطے کھانے لگا خیالات کی موجیں روئی کے ہلکے پھلکے گالے کی طرح مجھے اِدھر سے اُدھر بہائے پھر رہی تھیں مجھے خبر بھی نہ تھی کہ میں کنارے سے کتنی دور نکل آیا ہوں، خیالات اور تصورات کی دنیا بھی کتنی دلچسپ اور حسین ہوتی ہے آدمی خود ہی یہ باغ لگاتا ہے اور آپ ہی اس کی بہاروں میں کھو جاتا ہے میں دیکھ رہا تھا کہ میرے تاریک کمرے میں نیلے اور ہرے رنگین برقعوں کی ایک بھیڑ لگی ہوئی ہے اور میری بھوکی نگاہیں اِس بھیڑ کو چیرنے میں مصروف ہیں، ہنسی روح کی نکہتیں دماغ پر چھائی جا رہی ہیں، آرزوئیں دل و دماغ میں مچل رہی ہیں، باہر صحن میں پھر کچھ کھٹ

ہڑ بڑا کر میں چونک پڑا خیالات اور تصورات کی رنگینیاں اس طرح رخصت ہوگئیں جیسے کسی پھول سے معصوم تتلیوں کے غول ہوا چلتے ہی اڑ جاتے ہیں اور شاخ پر تنہا پھول جھولتا رہ جاتا ہے میں کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا

میاں ؟ —— کالے خاں نے اندھیرے کمرے میں جھانک کر کہا۔

کالے خاں بڑی دیر لگائی آجاؤ!

آپ تو ہتھیلی پر سرسوں جمانے کی فکر میں رہتے ہیں۔

کیا لے آئے ؟

آپ کے اقبال سے ! —— اس نے ایک گہرا سانس لے کر فتحمندانہ انداز سے کہا اور رات کے دھندلکے میں ایک برقعہ سایہ کی طرح ہلتا ہوا نظر آیا میرا دل اتنے زور سے دھڑکا کہ مجھے بار بار یہ اندیشہ ہو رہا تھا کہ عنقریب میں گر پڑوں گا! میرا سینہ پھٹ جائے گا۔

کالے خاں اُلٹے پاؤں واپس چلا گیا اور میں نے برقعہ کو جس پر میری نگاہیں جمی ہوئی تھیں آغوش میں لے کر مسہری کے قریب کر دیا۔ چند بار مسکراہٹوں کی فردوسی آوازیں کانوں میں آئیں، چوڑیوں سے نغمے پیدا ہوئے اور تاریکیوں میں تحلیل ہو گئے جیسے جگنو برسات کی اندھیری راتوں میں چمک کر غائب ہو جاتے ہیں دیر تک جذبات میں ہلچل رہی دو آدمیوں کے تیز اور گہرے سانس کمرے کی فضا میں گونجتے رہے جنہیں روح کی کچھ تھرتھراہٹیں بھی شامل تھیں اور پھر . . . . ؟ طوفان کم ہو گیا، بادل چھٹ گئے آندھی ختم ہو گئی دفعتہً بیٹھے بیٹھے کسی

نے زور سے میری کمر پہ دو ہنٹر رسید کیا چوڑیوں کا ساز زور سے بجا اور جھنک کے میں پھر کر دیکھوں کمرہ بجلی کی روشنی سے جگمگا اٹھا، بیگم کا ایک ہاتھ سوئچ پر تھا، لال لال انگارہ سی آنکھیں میرے مرجھائے ہوئے چہرے پر جمی ہوئی تھیں جیسے کوئی زخمی شیرنی بپھری ہوئی کھڑی ہو اور حملہ کرنے میں کوئی دیر ہی نہ ہو وہ تھر تھر کانپ رہی تھیں ان کے گورے گورے رخسار لالہ گوں ہو گئے تھے آنکھوں سے خون ٹپکا پڑتا تھا،

بیگم ؟ ——— میرے منہ سے ایک پھٹا ہوا آواز نکلا۔

خاموش ! انھوں نے زور سے زمین پر پاؤں مار کر کہا۔

میرے ہونٹ کانپنے لگے اور نہایت عاجزی سے میں نے ان کے سامنے سر جھکا دیا انھوں نے پھر سوئچ دبا دیا کمرے میں پھر تاریکی ہو گئی،

بیگم آپ تھیں ؟ ——— افسوس میں آپ کے حسن اور آپ کی جوانی سے بغاوت کر رہا تھا لیکن آپ کے حلقۂ حکومت سے پاؤں باہر نہ رکھ سکا،

اب بیگم میری نگاہوں میں حسین بھی تھیں اور جوان بھی ان کے حسن و شباب میں میرے جذبات کی آسودگی اور تسکین کے لئے سب کچھ موجود تھا، میں نے گلچینی کی بری عادت ترک کر دی اور میری منزلی زندگی میں بہار آگئی !

کبھی کبھی تنہائی میں یہ خیال توپ کے خطرناک گولہ کی طرح میرے دماغ اور احساس سے اب بھی ٹکرانے لگتا ہے کہ خیریت ہوئی کہ بیگم صاحبہ میرے ہی پاس آئیں مگر یہ تو ایک پلاٹ تھا جو بڑی کوشش اور ذہانت سے انھوں نے بنایا تھا انہیں سب کچھ معلوم تھا وہ مجھے اس طرح اپنا بنانا

چاہتی تھیں لیکن یہ کبھی تو ممکن تھا کہ میری محبت سے مایوس ہو کر وہ کسی اور مقصد کے لئے پلاٹ تیار کر لیتیں!

بابو کا شب نامچہ

میں اکثر دہلی آتا اور کئی کئی دن قیام کرتا یہاں کی اُس زندگی کا مجھے اب تک کوئی تجربہ نہ تھا جسے حسن و شباب کی زندگی کہنا چاہئے۔ میں آتا اور کسی سستے ہوٹل میں ٹھہر کر مصنوعی گھی میں پکی ہوئی مزیدار مچھلی اور روغن جوش کھا کر چلا جاتا میری جوانی اور جوانی کی ساری اُمنگیں پیٹ میں سمٹ آئی تھیں جو دہلی آتے ہی مچھلی اور مختلف قسم کے لذیذ سالن طلب کرنے لگا کرتیں۔ یہ سب کچھ اس لئے نہ تھا کہ میں کوئی جمالیاتی شعور نہ رکھتا تھا یا میری رگوں میں جذبات کی گرمی موجود نہ تھی بلکہ اس قسم کا کوئی موقعہ ہی نہ ملا تھا۔ کہ دل میں گناہ گاری کا آتش فشاں پھٹنے اور جسم کے مختلف حصّوں میں زلزلے کے جھٹکے محسوس کئے جائیں یقیناً میرے شعور اور لاشعور میں خواہشات کا ایک طوفان موجیں مار رہا تھا۔ لیکن ماحول کا مضبوط اور سنگین بند اس کی لہروں کے سامنے روک بنا ہوا تھا۔ بجلی کی تیز روشنی میں نواڑ کے نرم اور لچکدار پلنگ پر رنگین گدّا بچھا کر سونے کے ارادہ سے میں لیٹتا تو آنکھوں میں نیند کی سُرخی نمودار ہونے سے پہلے دل سے مختلف قسم کی آوازیں آتیں۔ کان انھیں سُنتے۔ رگیں اینٹھتیں۔ پٹھوں میں کچھ جھنجناہٹ سی ہوتی اور جسم کے اکثر حصّوں میں چیونٹیاں سی رینگنے لگتیں۔ جو گہری نیند آجانے پر بھی

رنگینی رہتیں لیکن میں ایک مہذب بابو تھا لوگ مجھے جانتے تھے۔ ہوٹل کا منیجر مجھے ایک شریف آدمی خیال کرکے ہمیشہ سب سے اچھے کمرے میں جگہ دیتا تھا۔ آخرکار سارا طوفان ان زنجیروں میں جکڑ کر رہ جاتا اور شباب کا ذرّہ گرد و پیش کی اِن عارضی حدود سے ٹکرا کر لوٹ جاتا۔ شعلے ٹھنڈے ہو جاتے چنگاریاں بجھ جاتیں۔ لاوہ سوکھ جاتا۔ اور کروٹیں بدلتے بدلتے صبح ہو جاتی!

خواہشات اور جوانی کی اُمنگیں شعور کے پرے ایک ایسی دنیا میں جو اوراک کی آنکھوں سے اوجھل تھی اُبل پڑنے کے لئے بے چین تھیں۔ مگر تہذیب اور شرافت کی شکستہ دیواریں جو کسی نہ کسی وقت دھڑام سے گر جانے والی تھیں انھیں سنبھالے ہوئے تھیں۔ مجبور اور کسی قومی تحریک کے انتظار میں رُکی ہوئی تھیں۔

اِس مرتبہ دہلی آنے کے ارادے سے میں ریل میں بیٹھا۔ تو ایک پُرانے دوست سے ملاقات ہو گئی۔ جو بیک وقت شاعر بھی تھے اور محرّک شعر بھی —— اُنھوں نے شہر کے ہوٹلوں کے اس منظر سے مجھے آگاہ کیا اور میں نے اپنی جہالت پر کافی افسوس کیا۔ تیز تلافی مافات کے لئے ایک خاص قسم کا جوش اور ایک عجیب نوع کا ولولہ بلکہ غصّہ اپنے اعصاب میں محسوس کیا۔ رات کو دس بجے کے قریب میل سے اتر کر سٹیشن کے پاس ہی ایک ہوٹل میں ٹھہر گیا۔

دس بج چکے تھے۔ سڑکوں پر کافی چہل پہل تھی۔ مگر مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ میری امیدیں سڑکوں پر سیلاب کی طرح بہتی ہوئی بھیڑ سے ہٹ کر ہوٹل کے کمروں میں بند ہو گئی تھیں۔ جگمگاتے اور...... اندھیرے

کمروں میں، جن کی تاریکیوں میں معلوم نہیں کتنی عصمتیں دفن تھیں اور کتنی دوشیزگیوں کا خون ان روشن اندھیروں میں چمک رہا تھا۔ بستر کھول کر بچھا لیا اور چائے پی کر آرام کرسی پر لیٹ گیا۔ نصف گھنٹہ کے بعد ایک شخص آیا۔ وہ میلی سی نیم آستین پہنے ہوئے تھا۔ جس سے پسینہ کی سڑاہند آرہی تھی اور گاڑھے کی موٹی دھوتی جو اس نے باندھ رکھی تھی۔ اس کے دل کی گہرائی کے آگے ایک آڑ بن کر رہ گئی تھی۔ شاید وہ میرے چہرے پر آسانی کے ساتھ جذبات کی تحریریں پڑھ رہا تھا اور میرے اندر جو انقلاب ہوا تھا وہ اسے بھی دیکھ رہا تھا۔ آتے ہی میرے قریب بیٹھ کر بولا کھانا وانا کچھ بابوجی!

میں نے اس کی الجھی ہوئی ڈاڑھی اور پتلی پتلی مونچھوں کو غور سے دیکھا وہ اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھوں کو جن میں سرمہ کی سیاہی خوب نمایاں تھی۔ میرے چہرے پر جمائے ہوئے تھا جیسے کوئی تجربہ کار آدمی سوراخ کے پاس رینگتے ہوئے سانپ پر نگاہیں جمائے موقعہ کا منتظر رہتا ہے۔

کیا کیا تیار ہے؟

سب کچھ ہے بابوجی۔ آپ کیا کھانا چاہتے ہیں؟

بتاؤ نا کیا کیا ہے؟

اجی سب کچھ ہے۔ کورمہ (قورمہ) ترکاری بڑا گوس (گوشت) روگن جوس (روغن جوش) اِشٹو، مچھلی۔ کواب، کباب، کیمہ (قیمہ) بریانی۔ میٹھا۔ بتائیے کیا لاؤں؟

بریانی اور کباب لے آؤ!

بس اور میٹھا بھی لے آؤں کیا تھوڑا سا؟

ہاں بس میٹھا نہیں کچھ نمکین لا سکتے ہو تو لاؤ

میں نے منہ پھیر کر دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ کہا۔

لانے کو تو ہم سب کچھ لا سکتے ہیں بابو جی!

اچھا یہ بات ہے؟

اور کیا اس نے اپنی داڑھی کو سلجھاتے ہوئے کہا۔

بڑے استاد معلوم ہوتے ہو؟

اجی بال دھوپ میں تھوڑا ہی سفید کئے ہیں ہم نے۔ جو کہہ دیں وہ نہ کر سکیں تو نام بدل دینا!

اخاہ! اور جو آگ کے سامنے کر لئے ہوں۔

آپ تو مطلب کی بات کہئے بابو جی!

تم تو خود ہی جانتے ہو کہنے کی کیا ضرورت ہے؟

اچھا تو سنئے ادھر دیکھئے۔ شیخ جی نے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں کھول کر مجھے دکھاتے ہوئے کہا۔

دیکھ لیا جی، دس نہیں بارہ، مگر؟

آگے آپ کچھ نہ کہئے ہم سب اگر مگر جانتے ہیں اس نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔

ایک گھنٹہ کے بعد وہ مسکراتا ہوا آیا۔ اس کے بڑے بڑے زرد رنگ کے دانت، کالے اور چیچک زدہ چہرے پر بالکل اس طرح نمایاں تھے جیسے

شریفہ پیڑ پر کپکپا کر چھٹ گیا ہو اور اس میں سے سفید سفید آنکھیں ابھر آئی ہوں
اس کے پیچھے پیچھے ایک عورت گہرے سرخ رنگ کے مصری برقعہ میں لپٹی
ہوئی کمرے میں داخل ہوئی اور ایک شرمیلے انداز سے کونہ میں کھڑی ہو گئی۔
وہ جلدی سے باہر چلا گیا۔ جیسے کوئی گہرے اور اندھے کنوئیں میں کسی کو دھکیل
کر بھاگ جاتا ہے عورت اسی طرح کھڑی رہی۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ کانپ
رہی ہے۔ آہستہ آہستہ کپکپی میں اضافہ ہوتا گیا۔ میں نے اس کی طرف دیکھتے
ہوئے کہا۔ برقعہ اُتار دو

چاند سے ابر کے ٹکڑے جتنی جلدی ہٹ جائیں اچھا ہے!

وہ بولی۔ مجھے جانے دیجئے۔

دیکھئے میں برباد ہو جاؤں گی   میں نے بڑی بھاری غلطی کی ہے
مجھے معاف کر دیجئے!

میرے اندھیرے دل میں ایک دم بجلی سی کوند گئی اور اس کے کونہ کونہ
میں اُجالا ہو گیا۔ جیسے کسی نے بجھتے ہوئے چراغ کی بتی اُبھار دی ہو۔ یہ سب
کچھ اتنی جلدی ہوا کہ میں سمجھ بھی نہ سکا۔ آن کی آن میں اتنا بڑا انقلاب کیونکہ
ہو گیا۔ اس کی آواز درد اور اثر میں ڈوبی ہوئی تھی اور اس نے میرے سوتے
ہوئے ضمیر کو جھنجھوڑ کر جگا دیا تھا۔

مجھے جانے دیجئے۔ اب میں یہاں نہیں ٹھہر سکتی۔

میں تمہیں روکنے کا ارادہ نہیں رکھتا۔ لیکن کیا تم بتا سکتی ہو تمہیں کس
غرض سے یہاں لایا گیا ہے؟

مجھے ؟ میں نہیں بتا سکتی۔ مجھ سے کچھ نہ پوچھئے مجھے جانے دیجئے!

تم آزاد ہو جس وقت تمہارا جی چاہے تم جا سکتی ہو۔ لیکن تمہیں بتانا ہوگا کہ تم یہاں کیوں آئی ہو۔ جب تک سچ سچ یہ نہ بتاؤ گی۔ میں نہیں جانے دوں گا۔ تمہاری گرفتاری اور آزادی اب تمہارے ہی ہاتھ میں ہے!

بات یہ ہے۔ وہ ہانپتے ہوئے بولی۔ میری ماں کئی دن سے بیمار ہے۔ میرا بھائی پردیس میں ہے۔ اس نے کئی مہینہ سے کچھ نہیں بھیجا۔ میری ماں چھالیہ کاٹ کاٹ کر اور ہوٹلوں کا دھنیا پیس پیس کر کچھ کما لیا کرتی تھی۔ پچھلے ہفتہ سے وہ بخار میں پڑی جل رہی ہے۔ گھر میں جس قدر اناج تھا ختم ہو گیا۔ ہم دونوں تین وقت سے بھوکے ہیں۔ میری ماں نے آج صبح کہا تھا۔ شیخ جی کے یہاں جاؤ اور ان سے کہو کہ ہوٹل کے منیجر سے ہمیں ایک روپیہ ادھار لا دیں۔ میں اچھی ہو جاؤں گی تو دھنیا اور مرچیں پیس پیس دوں گی۔ میں شیخ جی کے یہاں گئی ان کا اور ہمارا گھر پاس۔ پاس ہی ہے دروازہ ملا ہوا ہے۔ میں شیخ جی کے یہاں پہنچی۔ تو وہ منہ ہاتھ دھو کر ہوٹل جانے والے ہی تھے۔ انہوں نے سر سے پیر تک مجھے دیکھا۔ پھر بولے

کیوں آئی ہو آج سویرے ہی سویرے؟

میں نے اپنا مطلب بیان کیا۔ شیخ جی بولے۔ باؤلی منیجر ایک روپیہ کا ہے کو دیدیگا

میں کس برتے پر اس سے کہوں کسی کا روپیہ یوں پڑا تھوڑا ہی پھرتا ہے؟

پھر تمہیں اپنے پاس سے دے دو!

میں دے دوں ؟ میرے پاس کہاں رکھا ہے روپیہ؟

پھر، جاؤ لو یہیں؟

اور کیا کرو گی؟ پھر وہ کچھ سوچ کر بولے نہیں ذرا ٹھہرو!

کچھ کچھ آس بندھی اور میں کھڑی ہو گئی وہ میری صورت تک رہے تھے آج تک کبھی انھوں نے اس قدر غور کے ساتھ مجھے نہ دیکھا تھا۔

میں بجائے جا رہی تھی، شیخ جی نے میرا ہاتھ پکڑا اور ڈیوڑھی میں آہستہ سے میرے کان میں کہا۔ سکینہ اس وقت میں روپیہ تو نہیں دے سکتا۔ ہاں تیرے لئے ایک روزگار ڈھونڈھے دیتا ہوں۔ صبح سے شام تک ہُن برسا کریگا تیرے اوپر!

کیسا روزگار شیخ جی؟ میں نے آنکھیں نکال کر پوچھا۔

شیخ جی گھبرا کر بولے۔ برتن مانجھ دیا کرے گی تو ہوٹل کے؟ ابتک یہ کام میں کرتا ہوں۔ منیجر سے کہہ سن کے تجھے دلا دوں گا آرام سے دو چار پیسے مل جایا کرینگے بس ہوٹل تک چلنا ضرور پڑا کریگا۔ راضی ہو تو ماں سے پوچھ لے اپنی!

میرے دل میں شیخ جی کی باتوں سے جو بدگمانی پیدا ہو گئی تھی میں اس پر کچھ جھینپ سی گئی اور ان کا شکریہ ادا کرکے کہا شیخ جی مجھ سے یہ نہیں ہو گا جو کام تم کراؤ۔ یہیں کر سکتی ہوں وہاں نہیں جاؤں گی!

شیخ جی بولے۔ باؤلی ہوئی ہے۔ وہاں جانے میں کوئی ہرج ہے۔ اپنا گھر ہے اور پھر میں تو موجود ہی رہوں گا تیرے پاس۔ تیری ماں بیمار ہے اس سے ابھی کچھ کہنے سننے کی ضرورت نہیں۔ جب ذرا سنبھل جائے گی تو دیکھا جائے گا۔ بس دو گھنٹہ کی تو بات ہی ہے۔ یوں کر شام کو سات بجے چلا چلنا اور اتنی سی دیر کے لئے پوچھ کر بھی کیا کرے گی۔ کسی غیر کے ساتھ تھوڑا ہی جانا ہے تجھ کو؟

میں نے حامی بھرلی۔ مگر میرا دل دھڑکتا رہا۔ معلوم نہیں شیخ جی کیوں لئے جا رہے ہیں مجھے ہوٹل میں۔ مگر محلہ داری کا معاملہ تھا کوئی کھٹکے کی بات بھی نہ تھی۔ شیخ جی کا ہمارا کوئی آج کا ساتھ نہیں تھا۔ برسوں سے ایک دوسرے کو جانتے تھے۔ سورج ڈوبے ہوئے کوئی گھنٹہ بھر گذرا ہوگا کہ شیخ جی گھر گئے اور زنجیر ہلا کر مجھ سے کہا چلو! میں تانگہ میں بیٹھ کر آگئی۔ سامنے والے کمرے میں مجھے اُتار کر یہ بولے سکینہ ایک بہت اچھا دھندا ہاتھ آگیا ہے۔ ذرا سی دیر میں دس پانچ روپئے مل جائیں گے۔ تیری ماں بیمار ہے آخر خرچ کی تجھے ضرورت پڑے ہی گی اور جو اللہ نہ کرے بڑھیا کہیں مر مرا گئی تو کفن دفن کے لئے کس کے سامنے ہاتھ پھیلاتی پھرے گی۔ پیسہ پاس ہوگا تو وقت پر کوئی مشکل تو پیش نہ آئیگی۔ شیخ جی لگاتار کہے جا رہے تھے۔ میں ان کا منہ تک رہی تھی۔ میرا سر چکرا رہا تھا۔ کانوں میں سائیں سائیں کی آوازیں آرہی تھیں۔ جیسے کہیں دور چکی چل رہی ہو۔ یا پانی بہہ رہا ہو   لے، یہ ساری باندھ لے اوپر سے برقعہ اوڑھ لے آؤ پہلے منیجر صاحب کو سلام کرادوں۔ واسطہ تو اُنھیں سے پڑتا ہے۔ انھیں کی بدولت تیرا پیٹ بھرے گا۔ بس ابھی ابھی چلی جانا۔ اگر تو کہے گی۔ تو میں روز دس پانچ روپے یونہی دلادیا کروں گا۔ میں سر سے پیر تک کانپ گئی ساری اور برقعہ کو دیکھکر میرا رُواں رُواں کھڑا ہوگیا اور آنکھوں سے آنسو اُبل پڑے میں نے کہا شیخ جی میں کبھی نہ پہنوں   گی مجھے ابھی گھر پہنچا دو۔

شیخ جی نے طرح طرح کی دھمکیاں دیں آخر میں کہنے لگے، تو یہاں تک آگئی ہے تو ذرا سی بات کے لئے جھگڑا مول نہ لے۔ نہیں تو میں ابھی جاکر تیری

ماں سے کہدوں گا۔ مفت میں بدنامی ہو گی۔ دیکھ سکینہ وہ کام کر کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ تجھے چار پیسے بھی مل جائیں اور کسی کو کانوں کان خبر بھی نہ ہو۔ میں تجھے کوئی بُرا مشورہ نہیں دے رہا ہوں۔ ایک چلتا ہوا روزگار بتا رہا ہوں۔ چار چھ روپے آج کل کی مہنگائی میں تھوڑے نہیں ہیں۔ گھر بیٹھے مزے کرے گی۔ نہ کام نہ کاج مفت میں مٹھی بھر روپے ہاتھ آجائیں گے۔

اب میں شیخ جی کے بس میں تھی پر بندھی ہوئی چڑیا کی طرح ان کے ہاتھ میں پھڑپھڑا رہی تھی۔ دس پانچ روپے کے لالچ میں تو کیا آتی۔ البتہ بدنامی کے ڈر سے ہاتھ پیر ہلانے کی ہمت نہ ہوئی۔ ہوٹل تک آکر میں نے اپنے ہاتھ پاؤں بندھوائے تھے۔ شیخ جی سب کچھ کر سکتے تھے۔ میں نے آگ برساتی ہوئی آنکھوں سے شیخ جی کو دیکھا مجھے ان سے گھن آرہی تھی اور ان کی صورت سے ڈر معلوم ہو رہا تھا۔ بے بس ہو کر میں نے اُن کی بات مان لی   مجھے پیٹ کی آگ نے برباد نہیں کیا۔ بلکہ بیوقوفی کے ہاتھوں میں تباہ ہوئی۔

شیخ جی نے ایک پیالی چائے پلائی اور ایک بسکٹ دیا جسے میں نے کھالیا   مگر میری ماں   ! وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ پھر ذرا سنبھل کر بولی۔ شیخ جی پہلے مجھے مینیجر کے کمرے میں لے گئے اور ایک گھنٹہ میں وہاں رہی۔ وہ پھر رونے لگی اور یہاں پہونچکر اُس کی زبان بند ہوگئی اس کا دل اتنے زور زور سے دھڑک رہا تھا کہ میں برقعہ ہلتا ہوا محسوس کر

رہا تھا۔ میری آنکھوں سے چنگاریاں جھڑنے لگیں۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے میرے دماغ میں جس قسم کے جذبات اُمنڈ رہے تھے۔ وہ آپ ہی آپ دب گئے جیسے سوڈے کی بوتل کا اُبال بڑے سے بڑے گلاس میں ہلکا سا ہنگامہ پیدا کر کے غائب ہو جاتا ہے اور ننھے ننھے بلبلے ٹوٹ ٹوٹ کر نمکین پانی میں تحلیل ہو جاتے ہیں۔

وہ کوشش کر کے بھنچی ہوئی آواز میں بولی اور ایک گھنٹہ کی قیمت صرف وہ توقعات ہیں جو روزانہ دو چار گھنٹہ تک اس سڑے ہوئے گندے ماحول میں رہنے کے بعد ہی سر سبز ہو سکتی ہیں! شیخ جی پھانسی پر لٹکنے والے ایک مجرم کی طرح مجھے آپ کے کمرے میں کھینچ لائے ہیں۔

میں نے دروازہ کھول کر شیخ جی کو پکارا۔ وہ کچھ گھبرائے کچھ سہمے ہوئے آئے۔ میری آواز بہت زیادہ سخت ہو گئی تھی۔ آتے ہی شیخ جی بولے کیا بات ہے بابو جی؟ ———

ابھی میں کچھ کہنے نہ پایا تھا کہ انھوں نے سکینہ کو گھورتے ہوئے کہا۔ جو ابھی تک برقعہ اوڑھے میرے سامنے کھڑی پلک پلک کر رو رہی تھی سکینہ معلوم ہوتا ہے کہ تو نے بابو جی سے کوئی بات نہیں کی؟

خاموش رہو شیخ جی ——— اتم سکینہ سے کوئی بات نہیں کر سکتے۔ میں ابھی تمھیں پولیس کے حوالے کر دوں گا ——— بد ذات تو کیوں لایا یہاں سکینہ کو ———؟

بابو جی اس نے چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے مجھے اس طرح دیکھ کر کہا

جیسے کوئی کٹ کھنا کتا کسی کونہ میں دب کر اُس شخص کی طرف دیکھا کرتا ہے جو لکڑی یا بندوق تانے اس کے سامنے کھڑا ہو ــــــ اور کتا پچھلی ٹانگوں میں دُم دبائے غراغرا کر معافی کی التجائیں کر رہا ہو۔

شیخ جی ــــــ! میں نے ڈانٹ کر کہا۔ تم بڑے ناپاک آدمی ہو تمہاری آنکھوں سے مجھے شیطان جھانکتا ہوا نظر آ رہا ہے اور تم خود بھی تو شیطان ہی ہو۔

یہ شیطان تو آپ ہی کے لئے پال رکھا ہے بابو جی ــــــ سب کچھ آپ ہی کے لئے ہے۔ انصاف کیجئے۔ میں نے زبردستی تو نہیں کی تھی آپ سے!

جیسے کسی نے میری تڑپتی ہوئی رگ پر نشتر مار دیا ہو ــــــ واقعی اس نے مجھ پر زبردستی نہیں کی تھی۔ سکینہ کی تباہی کا ذمہ دار میں ہی ہوں اور شیخ جی کی آنکھوں سے جھانکنے والے شیطان کو بھی میں نے ہی سوتے سے جگایا تھا۔ پھر شیخ جی کا اس میں کیا قصور تھا۔ ساری خطا میری تھی۔

ــــــ آہ میری ــــــ! دنیا کے سب آدمی فرشتہ بن جائیں تو شیطان ایک دن بھی زندہ نہیں رہ سکتا سکینہ کو برباد کرنے والا شیطان شیخ جی کی آنکھوں سے نہیں جھانک رہا تھا بلکہ میرے دل میں بیٹھا ہوا تباہی پھیلا رہا تھا۔

میں نے دس دس روپے کے پانچ نوٹ سکینہ کو دیکر کہا ــــــ جاؤ ــــــ کبھی یہاں نہ آنا۔ اس نے میرے اصرار پر نوٹ لے لئے اور

برقعہ میں لپٹی ہوئی شیخ جی کے ساتھ چلی گئی۔ میں دروازہ تک اسکو دیکھتا رہا۔ کوئی اُسے روکتا تو نہیں ——— !

میں نہیں کہہ سکتا کہ سکینہ حسین تھی یا بدصورت! اتنا یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ وہ مظلوم تھی ——— کاش وہ پھر ظلم کے اس چکر میں نہ پھنسے!

اگلے دن ایک اور دوست نے کہا کہ اس قسم کے واقعات تو یہاں اکثر ہوا کرتے ہیں۔ سکینہ نے تمہیں بے وقوف بنا کر روپے وصول کر لئے مگر میرے نزدیک، یہ حادثہ اس سانحہ سے بہرحال کم دہشت انگیز ہے۔ جب میں سکینہ کو بے وقوف بنا کر اس کی دنیا کو ہلا دیتا ——— بیوقوف بننا بے وقوف بنانے سے کہیں بہتر ہے!

بیوہ کا شب نامچہ

سولہ سال کی عمر میں میری شادی ایک بچہ سے ہوگئی تھی جو صحیح معنی میں میرا شوہر بننے سے پہلے ہی مرگیا اور میں اٹھارہ سال کے سن میں بیوہ ہوگئی دونوں وقت دس بارہ آدمیوں کا کھانا پکانا اس کے بعد برتن مانجھنا، گھر میں جھاڑو دینا، چونکہ میں گوبری کو نا یہ میرے روزمرہ کے معمولی کام تھے۔ میں ایک میلی کچیلی دھوتی باندھے صبح سے شام تک ان دھندوں میں مصروف رہتی اور رات کو تھک کر

ایک ٹوٹے ہوئے پلنگ پر بغیر بستر بچھائے پڑ رہتی، میرے جسم پر کوئی زیور نہ تھا بس کانوں میں چاندی کی چند بالیاں تھیں، پہننے کو دو سفید ساریاں تھیں جب ایک ساری بالکل سیاہ ہو جاتی تو دوسری پہن لیا کرتی تھی جو دھوبی کے یہاں دھلنے کے بعد بھی جگہ جگہ سے کالی رہتی تھی جوتہ معلوم نہیں کب سے نہیں پہنا تھا، ننگے پاؤں پھرتے پھرتے پیروں کی بوائیاں پھٹ گئی تھیں، برتن مانجھتے مانجھتے ہاتھوں کی کھال موٹی پڑ گئی تھی اور جگہ جگہ سے پھٹ گئی تھی، پھٹی ہوئی کھال میں برتن مانجھتے وقت کوئلہ کی سیاہی بھر جاتی تھی جس کا صاف کرنا بھی اب مشکل ہو گیا تھا، اور یہی سیاہی ہاتھوں کا اصل رنگ بنکر رہ گئی تھی، میں جوان تھی اور میرے گھر والے مجھے سندر بھی کہتے تھے، لیکن قسمت خراب تھی مجھے وہ مسرتیں حاصل نہ تھیں جو دوسری عورتوں کو میسر تھیں، مجھے کوئی پسند کرنے والا نہ تھا، کوئی یہ پوچھنے والا بھی نہ تھا کہ بازار سے تمہیں کچھ لا دوں؟ میرے دیور اور جیٹھ جب دیورانی، جیٹھانی سے ہنس ہنس کر میٹھی میٹھی باتیں کرتے اور بازار سے انھیں طرح طرح کے تیل لا کر دیتے، منہ پر ملنے کو کریم لاتے بالوں میں لگانے کے لئے کلپ اور کنگھی، چوڑی لا کر دیتے تو میرے دل پر چوٹ سی لگتی۔ میں سوچتی کوئی مجھ سے یہ پوچھنے والا نہیں کہ تجھے بھی کچھ چاہیئے؟ بازار سے تو بھی کچھ منگا لے گی؟ کیا میں تیل نہیں لگا سکتی؟ کیا میرے بکھرے ہوئے بالوں کو کلپ کی ضرورت نہیں؟ میں بالوں میں کنگھی نہیں کر سکتی مگر میں عورت

کب تھی، میں تو ایک جانور تھی، بیوہ عورت کو یہ حق ہی کب حاصل ہے کہ وہ خود کو زندہ سمجھے، بناؤ سنگار کرنا زندہ عورتوں کا کام ہے۔

میرے کمسن شوہر کو مرے ہوئے دو سال ہو گئے تھے اُس وقت سے اب تک میں سسرال ہی میں رہی۔ جب میکہ سے کوئی لینے آتا، ساس جی رو کر کہتیں میرے مرے ہوئے بچہ کی نشانی ہے۔ یہ بھی آنکھوں سے دور ہو گئی تو میں کہیں کی نہ رہوں گی میرا جینا دو بھر ہو جائے گا میں تو اسی کو دیکھ دیکھ کر جیتی ہوں۔ یہ باتیں سنکر میرے میکہ والے سمجھتے ساس مجھ سے بڑی محبت کرتی ہیں وہ مجھے سر آنکھوں پر بٹھاتی ہیں اور میرا ان سے الگ ہونا اچھا نہیں، یہ سمجھ کر وہ مجھے چھوڑ جاتے اور میں روتی رہجاتی۔ بھائی اور باپ کے سامنے میرے منہ سے یہ بھی نہ نکلتا کہ دس پانچ دن ہی کو لئے چلو۔ میں اتنا کہدیتی تو معلوم نہیں مجھے کیا سمجھا جاتا میکہ والے آتے اور میری ظاہری حالت کو بھی دیکھتے مگر دو چار آنسو بہا نیکے علاوہ اور وہ کر ہی کیا سکتے تھے۔ وہ خود جانتے تھے اب میں اور ہوں کس کام کی، میری قسمت میں مرتے دم تک یہی لکھا ہے جو بھگت رہی ہوں، میرے نصیب پھوٹ چکے ہیں، میں بیوہ ہو چکی ہوں انھیں کیا خبر تھی ساس کس وجہ سے مجھے عزیز رکھتی ہیں انھوں نے کیوں مجھے اپنی آنکھوں کا تارہ بنا رکھا ہے، میں چلی جاتی تو یہ گھر بھر کا کام کون سمیٹتا جو کہ کرنے والا یہاں میرے سوا اور کون تھا۔ دیورانی اور جیٹھانی کو تو بننے سنورنے ہی سے فرصت نہ تھی۔ وہ ذرا دیر کو بھی چولھے کے پاس آجاتیں تو ہول دلی کی شکایت

ہو جاتی، کپڑے خراب ہو جاتے پھر میرے جانے کے بعد یہ دھندے کیونکر چلتے؟

آج اساڑھ کا مہینہ لگا تھا جیٹھ خوب تپ چکا تھا۔ سب کا خیال تھا برسات خوب ہوگی اور ہوا بھی یہی! اساڑھ کی پہلی ہی تاریخ کو اتنا پانی برسا کہ جل تھل ہوگئے۔ ہمارا گھر جگہ جگہ سے ٹپکتا تھا، میں پتیلی میں پانی بھر بھر کر پھینک رہی تھی۔ ہر بار پتیلی لے کر مجھے باہر نالی پر جانا پڑتا کوئی سو دفعہ میں آئی گئی۔ میں نے دیکھا قریب کے دروازے میں کرسی بچھائے پڑوس والے سیٹھ جی کا منجھلا لڑکا بیٹھا ہے اور مجھے دیکھکر جی ہی جی میں کچھ کُڑھ رہا ہے۔ ایک مرتبہ میں پانی پھینک کر پھری ہی تھی کہ وہ اپنے دروازے کی چوکھٹ پر اکڑ ہوا اور مجھے اس طرح دیکھنے لگا گویا وہ کچھ کہنا چاہتا ہے وہ کالی کور کی بہت صاف دھلی ہوئی دودھ کی طرح سفید دھوتی باندھے ہوئے تھا اور باریک تنزیب کا نہایت ہلکے پوت کا کرتہ پہنے ہوئے تھا جس کے نیچے سُرخ رنگ کی بنیائن جھلک رہی تھی۔ کرتہ کی آستینیں چنی ہوئی تھیں بائیں ہاتھ کی کلائی پر چھوٹی سی سنہری گھڑی بندھی ہوئی تھی سر کھلا ہوا تھا اور بالوں میں آڑھی مانگ نکلی ہوئی تھی۔ گوری چٹی پیشانی پر لال لال ٹیکہ چمک رہا تھا، میں نے مڑ کر اسکی طرف دیکھا تو وہ مسکرانے لگا۔ اُس کے سفید سفید چمکدار دانت جن پر پان کی ہلکی ہلکی سُرخی چڑھی ہوئی تھی۔ نمایاں ہوگئے۔ میں کچھ نہ بولی اور اُلٹے پاؤں لوٹ آئی، پھر جو پانی پھینکنے گئی تو وہ نالی کے پاس ہی ٹہل رہا تھا

میرے قریب آکر کہنے لگا کیا گھر میں ایک تم ہی ہو، گھنٹہ بھر سے دیکھ رہا ہوں کولہو کے بیل کی طرح جتی ہوئی ہو تمہیں اس حال میں دیکھکر میری آتما کو بڑا دکھ ہو رہا ہے۔ میں نے کوئی جواب نہ دیا، مگر آج پہلی دفعہ مجھے اپنی موجودہ زندگی سے کچھ نفرت سی محسوس ہوئی۔ میں نے اپنے جی میں کہا سیٹھ جی کہتے تو سچ ہیں، واقعی میں بڑی ذلیل عورت ہوں! میں پھر پانی لیکر گئی تو انھوں نے میری دھوتی کے پلّے کو جھٹک کر کہا، تم بولتی کیوں نہیں ہو کیا گونگی ہو؟

کیا بولوں؟

میں کیا پوچھ رہا ہوں؟

کیا پوچھتے ہیں آپ؟

گھر میں کوئی اور نہیں تمہارے؟

ہے کیوں نہیں۔

پھر تم ہی سے اتنا کام کیوں لیا جاتا ہے؟

میرے کرم ہی جو مر چکے!

سیٹھ جی نے درد بھرے لہجہ میں کہا، اس میں تمہارا کیا قصور ہے؟ مجھے سیٹھ جی کی باتیں بہت بھلی معلوم ہوئیں، پانی تو ختم ہو چکا تھا میں لوہے کی پرانت میں کیچڑ ہی سونت سونت کر لانے لگی جب میں آتی وہ مجھ سے کچھ نہ کچھ کہدیتے، ارے تم بیاہ کیوں نہیں کر لیتیں اپنا؟ کیا میرا بیاہ ہو سکتا ہے؟ میں نے اپنے دل سے سوال کیا ایسا تو کبھی

دنیا میں ہوا نہیں، پتی کے مر جانے پر عورتیں یوں ہی بیٹھے بیٹھے بوڑھی ہو جاتی ہیں۔

کیچڑ بھی نہ رہی تو ساس جی نے مجھے دوسرا کام بتا دیا۔ گھر میں نیم کا پیڑ تھا آندھی سے سارے گھر میں نبولیاں ہی نبولیاں ہو گئی تھیں اور آنگن میں پتے ہی پتے نظر آتے تھے، میں جھاڑو دینے لگی،

اب سیٹھ جی کا دستور ہو گیا کہ ہر وقت اپنی ڈیوڑھی میں بیٹھے رہتے، میں باہر بہت کم آتی تھی اندر کے دھندوں ہی سے دم لینے کی مہلت نہ ملتی تھی باہر کیونکر آتی؟ مگر اب میرے دل میں بھی آگ سی سلگنے لگی تھی۔ ہر وقت چھاتی میں ہوکیں سی اٹھتیں جیسے کلیجہ دھڑک رہا ہو، سیٹھ جی میری آنکھوں میں بس گئے تھے میں جب تک کام کرتی رہتی سیٹھ جی کا خیال رہتا اور جب کام کاج سے نمٹ کر پلنگ پر لیٹتی سیٹھ جی سامنے آ کھڑے ہوتے اب میں زیادہ تر یہی سوچتی رہتی کیا میرا بیاہ ہو سکتا ہے؟ اور کیا سیٹھ جی کو مجھ سے پریم ہو گیا ہے؟ وہی مجھ سے بیاہ کر لیں تو کیا ہرج ہے؟ میں کوشش کر کے باہر آنے کا کوئی نہ کوئی حیلہ نکالتی کبھی جھاڑو دینے کو ٹوکرا لے کر اسے پھینکنے کے بہانے سے آتی۔ کبھی دال کا دھوون کونڈے میں بھر کر لے آتی۔ ساس کہتی بھی بہو ذرا ذرا سے کام کو باہر جانے کی کیا ضرورت ہے، اپنے یہیں نالی میں ڈال دیا کرو، کوڑا الگ نیم کی جڑ میں اکٹھا کرتی رہو، میں کہتی گھر میں کوڑا برا معلوم ہوتا ہے اور نالی میں پانی بھرنے لگتا ہے وہ چپ ہو جاتیں سیٹھ جی کئی مرتبہ مجھ سے کہہ چکے تھے ذرا کسی دن

کھل کر بات چیت کرنے کا موقعہ نکالو!

کیسے نکالوں؟ سب تو میری چھاتی پر سوار رہتے ہیں،

رات کو سہی!

رات کو؟

ہاں رات کو!

رات کو میرا نکلنا بہت مشکل ہے!

کیوں مشکل کیوں ہے؟ دل مضبوط کر کے آجاؤ کسی دن آخر کوئی کرے گا کیا؟ تم جانوروں کی طرح کب تک بسر کرو گی۔ یہ چاند سا چہرہ کب تک سنگار سے محروم رہے گا اور یہ ہرنی کی سی آنکھیں کیا ہمیشہ ہی پھیکی روپ رہیں گی کبھی ان میں کاجل نہ لگاؤ گی تم؟

یہ کیونکر ممکن ہے؟

دنیا میں سب کچھ ممکن ہے!

اچھا تو آج رات کو آؤنگی،

میں یہیں ملوں گا،

سورج ڈوبتے ہی پہاڑ سے دھولی دھولی گھٹائیں جھومتی ہوئی اٹھیں تابڑ توڑ پانی برسنے لگا، بجلی کوندنے لگی بادل اتنے زور سے گرج رہا تھا کہ کلیجہ ہلنے لگتا تھا جلد ہی گھٹا ٹوپ اندھیری چھا گئی گھڑی گھڑی بادل گرجتا۔ بجلی چمکتی اور بڑی بڑی بوندیں پڑنے لگتیں، جیسے کوئی زور سے بیری کو ہلا دیتا ہے اور ٹپ ٹپ پکے ہوئے بیر

چھڑنے لگتے ہیں۔ میں نے جلدی جلدی کھانا پکا کر برتن میں دیا سب کھا چکے تو برتن دھوئے، پھر ساس جی کے سامنے بھوجن رکھا سب کے بعد میں نے دو چار لقمے کھائے، میرا دل بلیوں اچھل رہا تھا، یہ معلوم ہو رہا تھا میں نے کوئی نشہ کی چیز کھالی ہے، ہاتھ، پیر، زبان غرض کوئی چیز میرے قابو میں نہ تھی گھر کے سب آدمی کھا پی کر اپنے اپنے بستروں پر جا لیٹے، آج کی رات ہی کچھ عجیب قسم کی تھی دل چاہتا تھا کوئی باتیں کرے، پریم کی من لبھانے والی باتیں، گھڑی گھڑی پپیہا پکارتا پی کہاں؟ اور قریب ہی پہاڑ کے دامن میں مور چنگھاڑتے، میرا جی گھبرانے لگتا۔ ساس جی تھوڑی دیر تک چولھے کے پاس بیٹھی رہیں آخر وہ بھی اونگھنے لگیں اور پلنگ پہ جا پڑیں، ان کے سوتے ہی گھر میں سناٹا چھا گیا کبھی کبھی گھروں سے خراٹوں کی آواز آنے لگتی تھیں پرنالوں سے پانی گرنے کا شور مسلسل سنائی دے رہا تھا ہوا پیڑوں کو بری طرح جھنجوڑ رہی تھی، بوندیں باجہ سا بجا رہی تھیں، بجلی آگ کی بیٹوں کی طرح کالی گھٹا کو چیرتی ہوئی ادھر سے اُدھر جا نکلتی، کبھی کبھی جگنو اندھیری رات میں دیا جلا دیتے جو فوراً ہی بجھ جاتا۔ میں نے اچھی طرح بیسن لگا کر ہاتھ دھوئے دھلی ہوئی ساری باندھی اور بالوں کا جوڑا ذرا ٹھیک کر کے ننگے پاؤں پانی میں بھیگتی ہوئی چل کھڑی ہوئی۔ دہلی سے پاؤں نکالتے ہی میرا دل دھک سے ہو گیا۔ میں جلدی جلدی قدم اٹھاتی ہوئی دروازے تک پہنچ گئی۔ میرا سارا بدن کانپ رہا تھا اور رگیں زور زور سے اچھل

رہی تھیں۔ میں نے لرزتے ہوئے ہاتھ سے زنجیر کھولی اور ہمت کرکے سڑک پر آگئی ایسا معلوم ہوا کہ میں ایک دنیا سے نکل کر دوسری دنیا میں پہونچ گئی۔ سیٹھ جی اپنے دروازے میں ٹہل رہے تھے مجھے دیکھتے ہی خوشی سے پھول گئے اور اپنے پیچھے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ وہ گھر میں داخل ہوئے اور میں بھی ان کے پیچھے پیچھے دبے پاؤں کچھ دور چل کر زینہ پر چڑھ گئے۔ میں بھی ان کے پیچھے پیچھے زینہ تک پہونچ گئی اور پہونچ کر میں نے دیکھا نہایت صاف ستھرا کمرہ ہے، اور خوشبو سے مہک رہا ہے، فرش پر سفید چاندنی بچھی ہوئی تھی، ایک طرف مسہری لگی ہوئی تھی، میں ٹھٹک کر ایک طرف کھڑی ہو گئی۔ مجھے ننگے کپڑوں میں کھڑے ہوئے پاؤں چاندنی پر رکھتے ہوئے شرم سی آئی۔ سیٹھ جی نے ہاتھ پکڑ کر مجھے فرش پر گھسیٹ لیا اور تکیہ سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ میرا اپنا ہاتھ اب تک ان کے ہاتھ میں تھا وہ آہستہ آہستہ اُسے دبا رہے تھے، میرے سارے بدن میں بجلیاں سی دوڑتی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں، ایک مرتبہ انھوں نے میرے ہاتھ کی کھردری کھال پر انگلی پھیری اور غور سے ہاتھ کو دیکھ کر کہا اُوہ! تمہارے ہاتھ کیسے ہیں؟ یہ سیاہی کیسی ہے؟

میں اُن کے اس سوال سے شرما گئی پھر میں نے سب حال ان کو سنا دیا۔ وہ بہت دیر تک مجھ سے باتیں کرتے رہے پھر مجھے قریب بٹھا لیا ——— مجھے ایسا معلوم ہوا میرا سر بھاری ہو گیا ہے اور

آنکھیں باہر کو نکلی پڑ رہی ہیں، میں نیم بیہوش سی ہوگئی،
کوئی دو گھنٹہ کے بعد آپ ہی آپ مجھے وحشت ہوئی اور میں نے
سیٹھ جی سے کہا اب میں جاتی ہوں!

ابھی سے؟

بہت دیر ہوگئی، میں اپنی جان پہ کھیل کر آئی تھی

اچھا جاؤ! مگر بھول نا نہیں!!

میں اس کے جواب میں صرف مسکرا دی

وہ دروازے تک مجھے چھوڑ گئے میں نے آہستہ سے کواڑ بند کئے
اور اپنی جگہ پہ آپڑی صبح تک مجھے نیند نہ آئی سیٹھ جی کی محبت آمیز
باتیں یاد آتی رہیں،

بیوی کا شب نامچہ

میری شادی کو کئے مہینے ہو گئے تھے مگر اب تک میں نے ان
کا مزاج نہ پہچانا تھا یا انھوں نے پہچاننے نہ دیا تھا، واقعہ یہ ہے کہ اس
کا موقعہ ہی بہت کم ملا تھا دن بھر وہ دفتر میں رہتے اگر چھٹی میں گھر رہنا
نصیب بھی ہوتا تو ماں بہن اور بھائیوں کی وجہ سے بات کرنا بھی مشکل
ہوتا ہاں اتنا ضرور ہوتا کہ وہ گھر میں آتے تو میں کبھی کبھی گھونگھٹ اُٹھا کر انھیں
دیکھتی اور مسکرا دیتی وہ مجھے دیکھتے اور کچھ نہ کہتے رات کو باتیں کرتے

کا اچھا خاصہ وقت مل جاتا مگر وہ اتنے کم سخن تھے کہ کھل کر گفتگو بھی نہ کرتے بار بار میرے جی میں آتا آج ان سے پوچھوں تو سہی تمہیں مجھ سے محبت بھی ہے؟ یہ سوال ہونٹوں تک آکر رہ جاتا زبان ارادہ کا ساتھ نہ دیتی۔ مردوں کی نسبت میں یہ سنتی آئی تھی ان کی کسی بات کا اعتبار نہیں ہوتا اور ان کی محبت کا تو بالکل ہی کوئی یقین نہیں ہوتا۔ مردوں کی محبت ارنڈ کی جڑ سے زیادہ کمزور ہوتی ہے یہی سمجھ کر میں چپ ہو جاتی کہ میرے سوال سے شاید خفا ہو جائیں، بگڑ جائیں آخر مرد ہی تو ہیں۔ پھر یہ بھی ایک مصیبت تھی کہ وہ متین اور سنجیدہ بہت تھے ان کی متانت اور سنجیدگی ایسی جرأت کے خلاف فوراً حجاب بنا لیا کرتی تھی۔ وہ ہر وقت خاموش رہا کرتے تھے مجھے ان کی خاموشی سے بڑی الجھن ہوا کرتی تھی اسی لئے میں اپنے متعلق ان کی رائے معلوم کرنا چاہتی تھی

آج اتفاق سے گھر کے سب لوگ نمائش دیکھنے گئے تھے ان کی طبیعت ذرا مضمحل تھی میں ان کی وجہ سے گھر رہ گئی تھی۔ چھٹی نہ تھی وہ وقت سے پہلے ہی دفتر چلے گئے میں کھانا پکانے میں مصروف ہو گئی گیارہ بجے کے قریب وہ رخصت لے کر آئے تو میں چولہے کے سامنے بیٹھی ہوئی آگ جلا رہی تھی، لکڑیاں گیلی تھیں، پھونکتے پھونکتے ناک میں دم آگیا تھا آگ جلنے کا نام ہی نہ لیتی تھی لکڑی گھڑی گھڑی بھڑکتی لیکن زور زور سے پھونکتی، کبھی چمٹے کی نوک سے انگارے کریدتی دھوئیں کے غٹ کے غٹ چولہے سے نکل رہے تھے، آنکھوں کو دھواں لگتا تو ایسا معلوم ہوتا کہ آنکھوں میں کسی نے مرچیں پیس کر لگا دیں آپ ہی آپ آنکھوں سے پانی نکل رہا تھا، پوچھتے پوچھتے میرے دوپٹہ کا

ایک کونہ بھیگ چکا تھا، وہ دبے پاؤں آئے اور صحن میں کھڑے ہو کر مجھے دیکھنے لگے، پھر ایک چھوٹی سی کنکر اٹھا کر میری طرف پھینکی میں نے مڑ کر دیکھا آنکھوں میں پانی بھرا ہوا تھا صاف نظر نہ آیا مگر ہنسنے کی آواز آئی یہ پہلا موقعہ تھا کہ میں نے انھیں اسطرح ہنستے ہوئے دیکھا کہ چہرے پر متانت اور خشکی کی جگہ محبت کی تازگی محسوس ہوئی۔

کیا کر رہی ہو؟ انھوں نے پوچھا۔

کھانا پکار ہی ہوں، میں بولی

کیا پکایا ہے؟

سیب کی ترکاری!

کب تک نمٹ جاؤگی؟

ابھی نمٹی جاتی ہوں کیوں کوئی کام ہے کیا؟

ہاں ہے تو سہی اچھا پہلے کھانے سے فارغ ہو جاؤ!

میں نے جلدی جلدی ترکاری ٹھیک کر کے روٹی پکائی پھر کشتی میں کھانا لگا کر چھوٹی میز پر رکھ دیا اور ایک ہاتھ میں لوٹا دوسرے میں تولیہ اور صابن دانی لیکر میں نے ان سے کہا ہاتھ دھو لیجئے!

ہاتھ دھولوں یا منہ انھوں نے ہنسکر پوچھا آج وہ اپنی متانت اور سنجیدگی کو بالکل بھول گئے تھے آپ کا جی چاہے تو منہ بھی دھو ڈالئے!

میں نے کہا، میں پانی ڈالتی رہی اور وہ منہ دھوتے رہے آخر میں انھوں نے ایک چلو پانی لیکر میرے منہ پر ڈالدیا یہ بالکل ہی نئی بات تھی میں چونک

گئی اور یہ کیا؟ کہکر پیچھے کو ہٹ گئی پھر تولیہ سے منہ ہاتھ پونچھ کر کرسی پر بیٹھ گئے اور سامنے کی کرسی کی طرف اشارہ کرکے کہا بیٹھئے آپ بھی!

آپ ہی کھائیے!

اچھا آپ بیٹھئے تو سہی!

میں بیٹھ کر کیا کرونگی

آپ مجھے کھانا کھلائیں گی۔

کھانا تو خود ہی کھایا جاتا ہے۔

کھاؤں گا تو میں آپ ہی مگر کھلائیں گی آپ!

بہت اچھا، میں نے کہا اور روٹی توڑ کر بڑے تکلف سے میں نے لقمہ بنا کر اُن کے منہ میں دیدیا انھوں نے میری انگلیوں کو دانتوں میں دبا لیا، چھوڑیئے! میں نے کہا، دیکھئے میری انگلیاں زخمی ہو جائیں گی! —— اوئی ممیا میں مری! آخر اُنھوں نے انگلیاں چھوڑ دیں میں نے چمچہ ہاتھ میں لیکر کہا، اب اِس سے کھلاؤں گی، اس میں وہ مٹھاس کہاں؟ انھوں نے ہنسکر کہا، کھانے سے فارغ ہو کر وہ لیٹ گئے میں نے سامنے کرسی پر بیٹھ کر پنکھے کی رسی ہاتھ میں لے لی اور آہستہ آہستہ پنکھا کھینچ رہی! —— اتنی گرمی نہیں ہے، رہنے دو دیکھو ہاتھ تھک جائیں گے، انگلیاں دکھنے لگیں گی وہ کہتے رہے مگر میں برابر پنکھا کھینچتی رہی میں دیکھ رہی تھی آج وہ غیر معمولی طور پر گھڑی گھڑی ہنس رہے ہیں اور لگاتار مجھے دیکھتے جا رہے ہیں میں سر جھکائے بیٹھی تھی آخر مجھ سے نہ رہا گیا میں نے پوچھا آپ مجھے اتنے غور سے کیوں دیکھ رہے

ہیں کیا کوئی نئی بات پیدا ہو گئی مجھ میں؟

ہاں آج تم مجھے بہت اچھی معلوم ہو رہی ہو!

کیا اس سے پہلے میں بُری معلوم ہوا کرتی تھی۔

نہیں میرا یہ مطلب ہے کہ آج بہت ہی اچھی نظر آ رہی ہو۔

آخر کیا سبب ہے؟

میں نہیں بتا سکتا، شائد یہ وجہ ہو کہ میں بالکل بے تکلفی سے اس وقت لیٹا ہوں اور تم بالکل اطمینان سے میرے سامنے بیوی کی حیثیت سے بیٹھی ہو!

یہ تو کوئی بات نہ ہوئی!

کیوں بات کیوں نہ ہوئی میاں بیوی کی زندگی میں بے تکلفی نہ ہو تو شادی محض فرائض کی کشمکش ہو کر رہ جاتی ہے اور شادی کا اصل مقصد تکلفات کی تہ میں پوشیدہ ہو جاتا ہے اچھا تم بتاؤ تم مجھے اس وقت اتنی اچھی کیوں معلوم ہو رہی ہو۔

میں کیا بتاؤں آپ ہی جانیں ورنہ میں تو پہلے بھی بُری نہ تھی۔

یہ تو ٹھیک ہے لیکن یہ بتاؤ کہ مشرقی حدود جو میاں بیوی کے حقیقی رخوں کو ایک دوسرے سے چھپائے رکھتے ہیں کیا توڑ ڈالنے چاہئیں؟

میں سمجھی نہیں آپ نے کیا کہا؟

میں یہ کہتا ہوں کہ ہم دونوں الگ کسی مکان میں چل کر نہ رہیں۔

الگ رہنے میں کیا فائدہ۔

یہی کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے قریب رہکر اچھی طرح ایک دوسرے

کو سمجھ بیٹھے گے!
اب سمجھ کر کیا کریں گے ہمیں کوئی اور نئی زندگی تو اب شروع کرنا نہیں اس ناسمجھی میں جو کچھ ہو چکا وہی اسی سمجھداری اور دانشمندی میں ہوگا۔
شام تک گھر کے سب آدمی نمائش سے آگئے اور ہم پھر دور دور ہو گئے
اور سچ یہ ہے کہ اس جدائی کو میں نے بھی محسوس کیا اور غالباً انھوں نے بھی۔
اب میں کافی دلیر ہو گئی تھی پہلے جو سوالات میرے دماغ تک محدود رہا کرتے تھے اب زبان تک آنے لگے تھے ایک دن میں نے ان سے پوچھ لیا کیا آپ کو مجھ سے محبت ہے؟
انھوں نے غور سے مجھے دیکھا اور اپنی شربتی آنکھوں میں ایک میٹھی سی چمک پیدا کر کے بولے محبت؟ تم بتاؤ کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں یا نہیں!
مجھے تو ابھی کچھ خبر نہیں۔
سچ کہتی ہو کچھ نہیں معلوم تمہیں؟
بالکل سچ کہتی ہوں،
ارے تم بڑی بے خبر ہو اچھا سنو مجھے تم سے بڑی محبت ہے مگر اس کا سبب یہ نہیں ہے کہ تم بہت خوبصورت ہو اس میں شک نہیں تمہاری آنکھیں شراب برساتی ہیں اور ہونٹوں کا میٹھا پن دل کھینچتا ہے گالوں کی گلابیت کہتی ہے ہمیں سونگھو مگر اصل میں تمہارا اصل جوہر اور ہی ہے
وہ کیا میں نے سوال کیا اور جواب کے انتظار میں جلدی جلدی آرسی گھمانے لگی، وہ یہ کہ تم نے آج تک کبھی اپنے لئے مجھ سے کوئی خواہش نہیں کی

اور میری عزیزوں سے تم نے مجھ سے زیادہ محبت کی میری بے اتفاقی کو صبر سے برداشت کیا، میری اتنی طویل خاموشی اور خشکی اصل میں تمہارے امتحان کی بنا پر تھی اب تم امتحان میں پوری اتر چکیں بس یہی میری محبت کا مطلب ہے اچھا اب ہمیں اگلے ہفتے ہی کشمیر کی ایک گلپوش وادی میں چلنا ہے۔

کیوں؟ میں جلدی سے بولی۔

میرا تبادلہ شہر سے ایک دیہاتی مقام پہ ہو گیا ہے بڑی دلچسپ اور عاشقانہ جگہ ہے ہر طرف پھول ہی پھول کھلا کرتے ہیں اور ان کی نکہتیں ہوائیں شامل ہو کر دماغ میں پہونچتی ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آدمی محبت کا کوئی لطیف لخلخہ سونگھ رہا ہے؛

ہم دونوں وہیں چلیں گے۔

اور سب لوگ کیا یہیں رہیں گے؟

ہاں سب یہیں رہیں گے!

میرا دل کیونکر لگیگا وہاں تنہائی میں؟

تمہارا دل میں بہلایا کروں گا تم تنہا نہ رہو گی میں ہر وقت تمہارے پاس رہوں گا، وہاں مجھے کوئی کام نہ ہوگا، ایک ہفتہ کے اندر ہی ہم کشمیر پہونچ گئے وہاں پہونچتے ہی یہ محسوس ہوا کہ محبت کی کوئی جنت ہے جہاں میرے اور ان کے سوا کوئی اور نہیں ہے دن رات میٹھی میٹھی گفتگوئیں، دلچسپ باتیں سریلے گانے، اور خوش آئند نغمے فردوس گوش بنے رہتے جوانی کی خوش فعلیاں اور شباب کی رنگینیاں جنتِ نظر بن کر سامنے آیا کرتیں —— چند ماہ کے اندر

ہی معلوم ہوگیا کہ وہ تین مہینے کی رخصت لیکر آئے ہیں۔ میں کہتی ہوں اگر خدا نکردہ میں امتحان میں پاس نہ ہوتی تو معلوم مجھے کس دوزخ میں ڈالا جاتا؟ کشمیر کی دلچسپی کے وقت فطرت میری روح اور میرے دل و دماغ کے شانوں پر اس کشمیری، زندگی کی یادگار میں ایک ایسا بوجھ لاد چکی تھی جو اب وہاں سے منتقل ہو کر میری گود میں آگیا ہے اور جس کا نام ہے پریم شنکر!

تاجر کا شب نامچہ

دہلی میں میری کپڑے کی بہت بڑی دوکان تھی۔ دیسی کپڑے کا بہت بڑا ذخیرہ ہر وقت میرے یہاں موجود رہتا تھا۔ اور میں صرف دیسی کپڑے کی بدولت مالامال ہو گیا تھا۔ ہندوستانی ذہنیت پر میں لفظ دیسی نے ایسا اثر ڈال چکا تھا کہ وطن پرست حلقے میری امداد کے لئے ہر وقت تیار رہتے تھے ان کی رائے میں گویا میں ہندوستان کے غریب اور مفلس باشندوں کی بڑی خدمت کر رہا تھا کہ ان کی ضروریات کیلئے دیسی کپڑے تیار کر کے سستے داموں فروخت کرتا تھا معلوم نہیں میں اپنے غریب بھائیوں کی مدد کر رہا تھا آہستہ آہستہ دولت کے انبار جمع کرنے میں مصروف تھا۔ اس میں شک نہیں کہ جب معمولی سرمایہ سے میں نے دوکان کھولی ہے تو میرے دل میں ملک کی خدمت کا جذبہ ضرور موجود تھا اس کے بعد جب میرے پاس روپیہ بڑھتا گیا تو مال و دولت کی لالچ میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ آخر ایک وقت آیا جب

میں صرف تاجر رہ گیا حب الوطنی یا غریب دوستی کا کوئی جذبہ میری رگوں میں باقی نہ رہا۔ پھر بھی میں اپنے کام کی بدولت عام لوگوں میں بڑا محب وطن مشہور تھا۔ شروع شروع میں پوشیدہ طور پر میں غریب اور مجبور فقیروں کو کچھ دیدیا کرتا تھا۔ جب کوئی بھوکا ننگا میرے پاس آجاتا۔ میں اس کا پیٹ بھرنے اور تن ڈھانکنے کو کچھ نہ کچھ ضرور دیدیا کرتا۔ اس خصوصیت نے غریبوں کے طبقہ میں مجھے ہر دلعزیز بنا دیا تھا۔ میری دوکان پر جس نے بڑھتے بڑھتے اب کارخانہ کی شکل اختیار کر لی تھی۔ بہت سے آدمی نوکر تھے۔ لکھنے پڑھنے کپڑا بننے۔ اور دوسرے بیشمار کاموں کیلئے بیشمار ملازم تھے یہ سب میری رحمدلی اور خوش معاملگی پر اتنا بھروسہ رکھتے تھے جیسا دیندار قسم کے لوگ کسی مذہبی بات پر عقیدہ رکھ سکتے ہیں جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں۔ شروع میں ضرور میں ان اوصاف کا مالک تھا لیکن روپیہ جمع کرنے کے خبط میں اب تو مجھے اپنے کسی ملازم کا پیسہ ہضم کرنے اور اس کے حساب کو کم و بیش کر دینے میں بھی کوئی تامل نہ ہوتا تھا۔ میرٹھ کا رہنے والا ایک شخص رام دین بھی میرے یہاں نوکر تھا۔ بارہ روپیہ مہینہ اُس کی تنخواہ تھی۔ آدمی بڑا موٹا تازہ اور گورا چٹا تھا مگر تھا نہایت کام چور، جہاں میں اُسے لگا تا وہ اپنی سستی اور کاہلی سے کام خراب کر دیتا ہر شخص اُس کا شاکی تھا۔ مجبور ہو کر میں نے منیجر سے کہدیا کہ رام دین اگر ٹھیک ٹھیک کام نہ کرے تو اسکی تنخواہ کاٹ لیا کرو۔ پہلے ہی مہینے میں اسے بارہ روپیہ کی جگہ نو ملے تین روپے جرمانہ میں وضع ہو گئے۔ کئی مہینے تک یہ سلسلہ جاری رہا کبھی نو کبھی آٹھ اور کبھی اس سے بھی کم تنخواہ رام دین

کو ملتی اور وہ بغیر کچھ کہے سنے لے جاتا۔ ساون کے مہینے میں اس کی آدھی تنخواہ کا جرمانہ ہو گیا۔ تہوار کا زمانہ تھا ہر شخص کو خرچ کی ضرورت تھی۔ رام دین اپنی عادت کے موافق کچھ کہے سنے بغیر چھ روپے لے گیا — آج شام ہی سے آسمان پر موٹے موٹے بادل چھائے ہوئے تھے۔ دن چھپتے ہی مینہ برسنے لگا بجلی خوب چمک رہی تھی اور موسلا دھار مینہ برس رہا تھا۔ قریب قریب سارے نوکر چاکر جا چکے تھے جو باقی تھے وہ جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ دفتر بھی بند ہو چکا تھا میں اپنے کمرے میں صوفہ پر لیٹا سوچ رہا تھا کہ ذرا پانی تھمے تو ڈرائیور سے موٹر لانے کو کہوں۔ آج صبح بیوی کے اصرار پر یہ طے ہو گیا تھا کہ شام کو قطب چلیں گے مگر ایسے میں گھر سے پاؤں نکالنا بھی مشکل تھا۔ مجھے تو موٹر تک پہنچنا ہی دوبھر نظر آ رہا تھا اتنی دور جانا تو بڑی بات تھی بہر حال دوکان اور گھر میں سو دو سو میل کا فاصلہ نہ تھا جو سماں یہاں تھا وہی گھر بھی ہو گا اور پانی کی شدت نے یقیناً بیوی کے ارادے پر بھی وہی اثر کیا ہو گا، جو میرے ارادہ پر کیا تھا۔ بیوی نے بڑے اہتمام سے کپڑے بدلے ہوں گے۔ ناشتہ تیار کرنے میں بھی بڑی محنت کی ہو گی۔ بارش بہت بے موقعہ ہوئی میں سوچنے سوچتے یہیں تک پہونچا تھا کہ ایک دم سے ایسا معلوم ہوا کہ آسمان پھٹ گیا۔ بہت تیز روشنی ہوئی پھر اس زور سے بادل گرجا کہ میرا دل ہل گیا۔ ساتھ ہی ایک عورت جس کے کپڑے بھیگے ہوئے تھے گھبرا کر میرے کمرے میں گھس آئی اور میز سے ٹکرا کر دھڑام سے زمین پر گر پڑی میں چونک کر اٹھ بیٹھا کون ؟

سندری؟

سندری میری خاص ملازمہ تھی جب مجھے گھر پہونچنے میں دیر ہو جاتی تو اکثر وہ مجھے دیکھنے دُکان پر آجایا کرتی تھی۔

سندری نہیں سیٹھ جی میں ہوں! عورت نے بھیگے ہوئے لال رنگ کے ڈوپٹے سے منہ چھپاتے ہوئے مہین آواز میں کہا۔

میں نے تمہیں نہیں پہچانا تم کون ہو نام بتاؤ۔

وہ دری پر کھڑی تھی اور پانی کی بوندیں اس کے کپڑوں سے ٹپک ٹپک کر دری کو بھگو رہی تھیں میرے اس سوال پر اس کی زبان بند ہو گئی وہ کچھ نہ کہہ سکی۔

ارے بول تو کون ہے کیوں آئی ہے؟

سیٹھ جی میں ہوں رام دین......

رام دین کی گھر والی؟ کیوں آئی ہے۔

سیٹھ جی اس نے اپنی گوری گوری کلائی کو ہلاتے ہوئے کہا پیٹ نہیں بھرتا۔

کیوں نہیں بھرتا تیرا پیٹ؟

تنخواہ کاٹ لیتے ہو ساری۔

تنخواہ کیوں نہ کاٹوں، رام دین سے کام بھی تو نہیں ہوتا۔

سیٹھ جی وہ تو دن بھر.....

باولی تو نہیں جانتی وہ بڑا کام چور ہے۔

سیٹھ جی اب تو دیا کرو۔

دیا کیسے کروں مزدوری محنت کے بدلے میں ملا کرتی ہے۔

اس مہینہ میں تم نے چھ روپے کاٹ لئے سیٹھ جی!

جیسا وہ کام کرے گا ویسے میں دام دونگا۔

سیٹھ جی تہوار کے دن ہیں۔ اس نے بڑی لجاجت سے کہا اور گھونگھٹ کی آڑ سے اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے اُمید کے ساتھ مجھے دیکھا اسکی آنکھوں میں چمک تھی جو بجلی کی چمک میں ملکر اتنی تیز ہوگئی کہ میں اپنے دل میں ایک خاص قسم کی روشنی محسوس کرنے لگا اس کی لمبی لمبی پلکیں جو بہت تیزی سے حرکت کر رہی تھیں مجھے اپنے سینہ میں چبھتی ہوئی معلوم ہوئیں۔ ارے تجھے سردی نہیں معلوم ہوتی؟ میں نے پوچھا۔

بھوک میں سردی کیونکر معلوم ہوگی سیٹھ جی!

کیا واقعی تو بھوکی ہے۔

تمہارے سامنے جھوٹ نہیں بولونگی اَن داتا۔

اچھا ذرا اپنا دوپٹہ نچوڑ ڈال۔

اس نے غور سے مجھے دیکھا اب اسکی اجلی رنگت، ستواں ناک، اور پتلے پتلے ہونٹوں نے بھی مجھے متاثر کیا جو اس کے دیہاتی حسن کو اتنا دلچسپ بلکہ رنگین بنائے ہوئے تھے کہ دیکھنے والا تاب ہی نہ لا سکتا تھا۔ نکھری ہوئی صاف رنگت، اُبھرے ہوئے سُرخ انگارہ سے گال بائیں گال پر چمکتا ہوا ایک نیلگوں تل، میں ان سب چیزوں کو دیکھ کر سنبھل گیا اور باہر

تاریکی میں یہ دیکھنے لگا کوئی ہے تو نہیں ـــــ کیا نام ہے تیرا رام دین کی گھروالی!

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔

میں جذبات سے مجبور ہو کر کھڑا ہو گیا اور ایک خاص کشمکش میں ٹہلنا شروع کر دیا۔

ارے نام بتا اپنا گونگی ہو گئی کیا؟

اس کا بھی اس نے کوئی جواب نہ دیا۔

میں نے اس کا دوپٹہ پکڑ کر جھٹکا دیا ایک ہی جھٹکہ میں اس کا منہ گردن تک کھل گیا۔ ایسا معلوم ہوا جیسے بادل چھٹ گئے اور چاند نکل آیا۔

رام دین اور روپ رانی، میں نے للچائی ہوئی بلکہ چندھیائی ہوئی نگاہوں سے اسکی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ جلدی سے دوپٹہ ٹھیک کر کے پرے جا کر کھڑی ہو گئی۔

یہ پیٹ بھرنے کی باتیں نہیں ہیں سنا تو نے؟

وہ کچھ نہ بولی میں نے پھر قریب جا کر وہی حرکت کی۔

سیٹھ جی میں بھوکی ہوں مجھ پر دیا کرو!

میں تیرا پیٹ بھر دوں گا۔

تنخواہ دیدو مجھے پوری چھ روپے میں پیٹ نہیں بھرے گا!

ایسی کتنی ہی تنخواہیں دے دونگا اور کچھ سمجھی نہیں تو میرا مطلب؟

میں نہیں سمجھی سیٹھ جی آپ بڑے آدمی ہیں۔

بڑے آدمیوں کے بھی سینہ میں دل ہوتا ہے۔ میں نے یہ کہہ کر اپنا آفس بکس کھولا اور اس میں سے دس روپے نکال کر اُس کے سامنے ڈال دیئے روپیوں کی جھنکار سے وہ چونک گئی اس نے بڑی بیتابی سے جھک کر دونوں ہاتھوں سے روپیئے اُٹھا لئے۔ تھوڑی دیر کے لئے اس کا منہ پھر کھل گیا۔ اور میں نے دیکھا کہ وہ حسن کی ایک ملکہ ہے جس کو قدرت نے نہ معلوم کیوں رام دین کے حوالے کر کے یہ سزا دی ہے کہ میرے سامنے ہاتھ پھیلانے پر مجبور بنا دیا ہے حالانکہ صحیح معنوں میں مجھے اس کے سامنے ہاتھ پھیلانا چاہیئے تھا اور سچ یہ ہے اس وقت میرا ہاتھ اس کے سامنے پھیلا ہوا تھا۔ میں جب اس سے کچھ کہتا وہ گڑگڑا کر کہتی۔ سیٹھ جی میں بھوکی ہوں مجھ پر دیا کرو۔ واقعی وہ بھوکی تھی اس کا منہ اترا ہوا تھا ہونٹ سوکھ گئے تھے آنکھوں میں وہ دیئے جھلملا رہے تھے جو فاقہ کی آگ ہی سے جلا کرتے ہیں

دس روپیئے میں بھی تیرا پیٹ نہ بھر یگا کیا؟

بھر جائیگا مگر میں کوئی سودا بیچنے نہیں آئی۔ اس نے میری نگاہوں کی بھوک اور آتما کی پیاس کو محسوس کر کے کہا۔ میں اس وقت بالکل دیوانہ ہو گیا تھا۔ جذبات کا بھوت میرے سر پر سوار تھا۔ میں نے اس کی بھوک کا کوئی احترام نہ کیا۔ میں نے یہ نہیں سوچا کہ وہ بھوک کی آگ بجھانے میرے یہاں آئی ہے۔ میں اس سے ایسے وقت میں کوئی سودا نہ کروں۔ مگر میری آنکھیں بند ہو گئی تھیں عقل کی روشنی مدہم ہی پڑ گئی تھی بلکہ بجھ گئی تھی۔ میں نے سرمایہ داری کے نشہ میں مال و دولت کے غرور میں ایک بھوکی عورت

کو اپنے حریصانہ ارادوں کا شکار بنانے کی کوشش کی۔

بادل پھر زور سے گرجا ایسا معلوم ہوا میری دوکان پر بجلی ٹوٹ پڑی میں سہم کر باہر جھانکنے لگا اس نے پھر اسی لہجہ میں کہا۔ سیٹھ جی بھوک لگی ہے۔ مجھے جانے دو!

یہ کہکر اس نے ایک چھلانگ لگائی۔ بالکل وحشی ہرنی کی طرح اور ویرانوں کی اندھیری میں غائب ہوگئی۔

میں نے کامیابی کے پورے یقین کے ساتھ سوچنا شروع کردیا رام دین بارہ روپے تنخواہ پانے والا رام دین حسن کے اس گنجینہ کو مجھ سے چھپا اور بچا کر نہیں رکھ سکتا بھوک کی جو آگ آج اسے میرے گھر لائی تھی دس بیس دن میں پھر لائیگی پیاسے کا کنوئیں پر آنا لازمی ہے

صوفی کا شب نامچہ

میں شروع ہی سے کچھ خاموش اور ریاکار واقع ہوا تھا۔ اپنی طبعیت کا یہ جوہر اس وقت مجھ پر ظاہر ہوا۔ جب میں نے صوفی کی حیثیت سے اپنے آپ کو دنیا کے سامنے پیش کیا۔ پہلے تو صرف یہی تھا کہ میں کھاتا گوشت روٹی اور کوئی پوچھتا تو کہتا کہ مسور کی دال کھائی ہے۔ یا مارتا بیوی کو اور جب اس کے رونے کی آواز باہر جاتی اور اہل محلہ پوچھتے کس کو مار رہے ہو تو کہدیا کرتا یہ کم بخت لڑکی پڑھنے میں دل نہیں لگاتی۔ قاعدے کا

سبق یاد نہیں کیا تو غصہ آ گیا اور ایک تسبیح کھینچ ماری میں نے! حالانکہ تسبیح کی جگہ میرے ہاتھ میں موٹا سا بیت ہوتا تھا۔ رفتہ رفتہ میرے بہت سے عقیدتمند پیدا ہو گئے۔ اور میں ایک کامیاب صوفی کے لباس میں جلوہ گر ہوا۔ اب ریاکاری کا رخ مذہبیات کی طرف پھر گیا۔ صبح کو کوئی مرید آتا اور پوچھتا حضرت آج تو آنکھوں میں سُرخی بہت نمایاں ہے۔ معلوم ہوتا ہے رات کو آرام نہیں فرمایا حالانکہ آنکھ کی سُرخی نتیجہ ہوتی تھی زیادہ سونے کا مگر میں فوراً کہتا بھائی کیا کہوں رات بھر سو نہیں تین چار روز سے کچھ پڑھنے میں مصروف ہوں بس یوں سمجھو کہ تخت پر بیٹھے بیٹھے صبح ہو جاتی ہے۔ جس پیشہ کو میں نے شروع کیا تھا بہت ہی عجیب اور آسان پیشہ تھا۔ خصوصاً مالدار بننے کے لئے تو دنیا میں اس سے بہتر کوئی ذریعہ نہیں کہ آدمی صوفی بن جائے۔ آہستہ آہستہ میری شہرت پھیلنے لگی۔ اور ایک وقت آیا کہ دور تک میرا نام مشہور ہو گیا۔ روزانہ بکثرت خطوط اور منی آرڈر میرے پاس آتے لوگ دعا کی التجائیں کرتے۔ تعویذ مانگتے اور میں اُنھیں اطلاع دیتا کہ مطمئن رہو۔ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاؤ گے۔ اکثر لوگ خود ہی اپنا مقصد لیکر میرے پاس آ جاتے اور میں ان سے ایسی ذومعنی گفتگو کرتا کہ وہ بھی حیران رہ جاتے ایک صاحب ترقی کی دعا کرانے آئے میں نے تھوڑی دیر آنکھیں بند کر کے دفعتہ سر اٹھا کر کہا ـــــ دس، دس! بس اس سے زیادہ نہیں۔ اس نے سمجھ لیا ترقی دس روپے سے زیادہ نہیں ہوگی۔ اس نے درخواست میں بیس

روپے کی استدعا کی تھی۔ مگر میں نے عقل سے کام لیکر فیصلہ کر لیا کہ منہ مانگی چیز کا ملنا ضروری نہیں بیس مانگتے ہیں تو دس دینے میں افسران کو بھی کوئی عذر نہ ہوگا۔ چنانچہ میرا یہ قیاس صحیح نکلا۔ اس واقعہ کے بعد میرے عقیدت کیشوں میں کافی اضافہ ہوگیا اور میری اس کرامت کا بڑی شدو مد سے اشتہار دیا گیا ایک دن میں سہارنپور سے واپس آرہا تھا راستہ میں ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر دو تین آدمی ملے انہوں نے مجھے وہیں اُتار لیا۔ ان لوگوں کا تعلق ارباب رقص وسرود سے تھا۔ ایک صاحب کو شکایت تھی کہ ان کی آواز خراب ہے اور جس مجلس میں وہ گانا شروع کر دیتے ہیں تھوڑی دیر بعد ہی وہ خالی ہو جاتی ہے۔ دوسرے بزرگ حسن و عشق کا شکار تھے کسی کی نگاہ ناز کا تیر نیم کش ان کے قلب میں پیوست تھا۔ دونوں نے عاجزانہ التجائیں کیں یہ پہلا موقعہ تھا کہ مجھے یہ سوچنا پڑا کہ ایک خراب آواز کو کیونکر اچھی اور دلپسند آواز میں تبدیل کیا جا سکتا ہے اپنی بے بسی کا احساس ہوا مگر سپر نہ ڈالی اور تھوڑا سا پانی پڑھ کر انھیں دے دیا دوسرے صاحب کو چند تعویذ لکھ دیدیئے اور ان سے کہا کہ اپنے محبوب کو مجھے دکھا دیں اپنے ہاتھ سے ایک پان اسے کھلا دوں گا وہ تمہارے لئے بے چین ہو جائیگا وہ دن چھپتے ہی مجھے ویران اور اندھیری سڑکوں اور گلیوں سے گذارتے ہوئے ایک بالاخانہ پر لے گئے اور گانا سننے کے حیلہ سے مجھے اپنے قبلۂ مقصود سے متعارف کرا دیا۔ سولہ سترہ سال کی ایک الٹر لڑکی جو سر سے پیر تک صانع قدرت کی حسن کاریوں کا دلچسپ

مونہ تھی۔ قیمتی کپڑوں میں ملبوس عطر و غازہ کی حسن انگیز خوشبوؤں سے معطر میرے سامنے بیٹھی تھی میرا دل پہلی ہی نظر میں اس کے آستانہ حسن پر سجدہ ریز ہو گیا اور سر سے پیر تک مجھ پر لرزہ سا طاری ہو گیا۔
عشق اور تصوف میں ایک خاص قسم کا معنوی ربط ہے اور یہ بالکل حقیقت ہے کہ میرے دل میں ابتدا ہی سے کافی گداز تھا۔ میں شروع سے حسن کا احترام کرنے کا عادی تھا، تاہم میرا دل حریف حسن نہ تھا میں نے کبھی اس سلسلہ میں اپنے صبر و ضبط کو نہ آزمایا تھا۔ آج پہلی مرتبہ معلوم ہوا کہ میں بہت کمزور ہوں حسن کے ایک ہی اشارۂ ابرو پر میرا دل سرنگوں ہو گیا۔ تھوڑی دیر میں چپ رہا اس عرصہ میں وہ مجسمہ حسن و شباب اور نادرۂ جمال و رعنائی نہایت دلچسپ حرکات کرتی رہی کبھی تو انگلیاں چٹخاتی۔ کبھی انگلیوں میں بڑے بڑے طلائی چھلوں کو گھماتی، کبھی انگڑائیاں لیتی اور کبھی پان اٹھا اٹھا کر منہ میں رکھتی آخر مجھ سے نہ رہا گیا اور میں نے پوچھا تمہارا نام کیا ہے؟

بے بی رشیدہ!

کب سے یہ کام کرتی ہو؟

جب سے پیدا ہوئی ہوں!

تو پھر تم خوب گاتی ہو گی؟

یہ سننے سے معلوم ہو گا۔

اچھا سناؤ کچھ!

اس نے چند مشہور غزلیں گائیں مجھ پر وجد طاری ہو گیا۔ اور آج پہلی مرتبہ مجھ پر یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ واقعی عشق مجازی عشق حقیقی کا زینہ ہے۔ وہ گا بھی چکی مگر میں دیر تک سر جھومتا رہا۔ پھر آنکھیں کھول کر میں نے کہا قریب آؤ۔ وہ سرک کر ذرا آگے آ گئی۔ میں نے تھالی میں سے ــــــ پان کا بیڑا اٹھا کر کہا۔ منہ کھولو! اس نے شرما کر اور کچھ مسکرا کر منہ پھیر لیا۔ ایک استاد نے کہا بے بی رشیدہ منہ کھول دو فقیروں کا کہنا نہیں ٹالا کرتے اس نے بڑی مشکل سے منہ کھولا میں نے بیڑا منہ میں دے دیا اس نے لجائی اور شرمائی ہوئی نگاہوں سے مجھے دیکھا۔ میرا قلب سینہ میں تڑپنے لگا جیسے کوئی زخمی پرند تیر یا بندوق کا چھرا لگ جانے کے بعد پھڑپھڑایا کرتا ہے۔ آہ اب میں خود ہی مریض تھا تاہم اپنے عقیدتمند سے میں نے کہہ دیا کہ تمہارا مقصد پورا ہو گیا چند روز میں وہاں مقیم رہا اور روزانہ بے بی رشیدہ جان کے یہاں جاتا جس دن نہ جاتا وہاں سے آدمی بلانے آجاتا جس روز سے میں نے وہاں آمد و رفت شروع کی تھی بے بی رشیدہ کی آمدنی میں نمایاں اضافہ ہو گیا تھا اور گھر کے سب لوگ میرے معتقد ہو گئے تھے۔

ایک روز شام سے مطلع ابر آلود ہو گیا اور پھر بارش کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اساڑھ ختم ہو کر ساون لگا تھا لوگ کہہ رہے تھے کہ آج اساڑھ ساون سے گلے مل رہا ہے۔ مینہ بہت برسے گا۔ چنانچہ واقعی ایسا ہی ہوا، بڑی شدت کا مینھ برسا خوب بجلی کڑکی اور بادل گرجے، دل نے تقاضہ کیا آج تو ضرور ہی چلنا چاہئے مگر پانی رکنے کا نام ہی نہ لیتا تھا۔

ہر طرف اندھیری چھائی ہوئی تھی۔ بھیانک اندھیری، سڑکوں پر پانی زور شور سے بہ رہا تھا۔ ہر طرف سے سائیں سائیں کی آوازیں آرہی تھیں ایسے میں گھر سے قدم نکالنے کی ہمت نہ ہوئی بلکہ زیادہ سچ یہ ہے کہ دانستہ ارادہ ملتوی کر دیا تاکہ کسی کو بیتابی دل کا اندازہ نہ ہو۔ اتنے میں بے بی رشیدہ جان نے آپ ہی تانگہ بھیجدیا میں خوشی خوشی تانگہ میں بیٹھ کر چلا گیا۔ اتفاق سے رشیدہ تنہا تھی اس نے سرو قد کھڑے ہو کر میرا استقبال کیا اور ادب سے ماتھے پر ہاتھ رکھکر کمر کو کافی خم کرکے سلام کیا۔ میں نے سر پہ ہاتھ پھیر کر کہا۔

رشیدہ آج تم اکیلی معلوم ہوتی ہو؟

نہیں حضرت اکیلی نہیں ہوں!

اور کون ہے تمہارے پاس؟

اس نے آسمان کی طرف انگلی اٹھاکر کہا وہ!

میں نے اتنے زور سے سر دھنا کہ بال تتر بتر ہو گئے پھر دیر تک، دوزانو بیٹھا رہا رشیدہ میرے قریب ہی بیٹھی تھی بادل گرج رہا تھا، بجلی کوندرہی تھی اور پانی کی بڑی بڑی بوندیں ٹپ ٹپ پختہ فرش پہ گر رہی تھیں کبھی باغ میں پپیہا پی کہاں، پی کہاں پکار اٹھتا۔ عجب سماں تھا۔ میں نے کہا رشیدہ!

وہ بولی، جی!

کچھ سناؤ!

اس نے بہت اچھا کہا اور ہارمونیم لے کر گانا شروع کیا۔

اک برق سرِ طور ہے لہرائی ہوئی سی
دیکھوں ترے ہونٹوں پہ ہنسی آئی ہوئی سی

میں نے پہلے ہی شعر پر بیتاب ہو کر کہا۔ رشیدہ زندہ باش!
غزل پوری کرنے کے بعد وہ پھر کچھ گانا چاہتی تھی مگر میں نے یہ کہکر روک دیا۔ رشیدہ اب چپ رہو ورنہ میرا دل پھٹ جائے گا۔
پانی برابر برسے جا رہا تھا۔ کالے کالے بادل آسمان پر منڈلا رہے تھے۔ بجلی بار باران کا سینہ چیر کر جھانکتی اور آسمان پر ایک حسین تبسم کی لہر دوڑ جاتی۔
بے بی رشیدہ، میں نے کہا۔
جی! وہ بولی
آج میں تمہیں کچھ ایسی باتیں بتانا چاہتا ہوں جو تم نے کبھی نہ سنی ہونگی۔
بتائیے! وہ بولی۔
یوں نہیں۔
اور کیونکر؟
بے تکلفی کیساتھ سننے کو تیار ہو جاؤ۔
میں آپ سے بالکل بے تکلف ہوں۔
اچھا پان کھلاؤ۔ میں نے کہا۔
اس نے پتلی پتلی حنا آلود انگلیوں سے ایک ورق میں لپٹا ہوا بیڑا میرے منہ میں رکھدیا۔

اس وقت واقعی وہ بے تکلف تھی۔ جذبات آہستہ آہستہ سُرخی میں تبدیل ہو کر اس کے چہرے پر دوڑ رہے تھے۔ میں بھی ازخود رفتہ تھا۔ اس نے مجھے مضطرب دیکھ کر کہا۔

کچھ پلاؤں ؟

کیا پلاؤگی رشیدہ زہر؟

جو میں پلاؤں پی لیجئے!

ضرور پیونگا!

وہ بلّور کے شفاف گلاس میں ایک سُرخ رنگ کا سیال بھر لائی۔ اور میرے ہونٹوں سے لگا دیا۔ میں نے اُس کی بڑی بڑی سُرخ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا ؎

دنیا وہ ان کا ساغر ہے یاد ہے نظام
منہ پھیر کر اُدھر کو ادھر کو بڑھا کے ہاتھ

آتشِ سیال کے جرعاتِ تلخ حلق سے اُترتے ہی ایسا معلوم ہُوا کہ میں کسی اور دُنیا میں پہونچ گیا جہاں حسن و عشق اس طرح دست و گریبان ہیں جیسے شب و روز۔ میں نہیں کہہ سکتا۔ اس خمار حسین کا انجام کیا ہوا ——— صبح کو جب میں بیدار ہوا ہوں غالباً ۵ بجے تھے۔ آسمان بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ پرنالے زور زور سے مکانات کے پختہ فرشوں پر گر رہے تھے اور دو بھیگی ہوئی بلیاں قریب ہی ایک چھت پر لڑ رہی تھیں ———

——— ... ———

مُسافر کا شب نامچہ

میں اپنا سوٹ کیس بائیں ہاتھ میں لٹکائے ہوئے بڑی بدحواسی کے ساتھ دہلی کے اسٹیشن پر پہونچا گاڑی چھوٹنے ہی کو تھی - میں نے اضطراب کے ساتھ ڈبوں میں جھانکنا شروع کیا - ایک سیکنڈ کلاس میں تھوڑی سی جگہ تھی گاڑی سیٹی دے چکی تھی میں جلدی سے کھڑکی کھول کر اس میں داخل ہو گیا - گاڑی پہلے آہستہ آہستہ پھر تیز تیز چلنے لگی اگرچہ مجھے جگہ مل گئی تھی لیکن معلوم نہیں میرا اضطراب کیوں بڑھ رہا تھا - میں نے جیب سے دستی نکال کر پیشانی کا پسینہ پونچھا پھر مسافروں پر ایک متجسسانہ نظر ڈالی دو تین آدمی بستر بچھائے لیٹے تھے - مگر انھیں صرف اپنے آرام سے بحث تھی - میری تکلیف سے کوئی ہمدردی نہ تھی ایک حسین خاتون بڑے تعجب اور غور سے میری بدحواسانہ حرکات کو دیکھ رہی تھی اور خود بخود مسکرا رہی تھی اس کو دیکھتے ہی میں چونک گیا اب مجھے احساس ہوا کہ میں واقعی بدحواس تھا اور معلوم نہیں اس دوران میں کیسی کیسی مضحکہ خیز حرکتیں مجھ سے سرزد ہو چکی تھیں - میں نے اپنے سراپا پر ایک نگاہ ڈالی اور بیٹھنے کے لئے نشستوں کا جائزہ لیا - خاتون نے بدستور مسکراتے ہوئے کہا جگہ چاہئے آپ کو بیٹھنے کے لئے ؟

جی ہاں بس تھوڑی سی !

ادھر آئیے یہ ہے جگہ، اس نے اپنے سامنے والی نشست کی

طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ میں سوٹ کیس اپنے قریب رکھکر بیٹھ گیا۔ آپ کہاں تشریف لے جائیں گی؟

میں، اس نے مسکرا کر پوچھا۔

جی ہاں آپ!

اچھا آپ تو بتائیے پہلے کہاں جائیے گا؟

بمبئی جاؤں گا!

کراچی ہوکر جائیے گا غالباً؟

نہیں صاحب میں سیدھا بمبئی جاؤں گا!

مگر یہ گاڑی لاہور جا رہی ہے اس وقت، وہاں سے واپس ہوکر ممکن ہے بمبئی چلی جائے۔

اچھا لاہور کی ریل میں بیٹھ گیا میں' ارے توبہ، خدا کے لئے! کیا مقصد آپ کا کھڑکی کھول دوں۔ کودنے کا ارادہ ہے؟

نہیں، نہیں، بتائیے تو میں کیا کروں؟

اب آپ کچھ نہیں کر سکتے بیٹھ جائیے۔

کچھ بھی نہیں کر سکتا میں؟

جی ہاں اس وقت کچھ نہیں کیا جا سکتا پہلا اسٹیشن آنے پر اتر جائیے گا۔

کب یہ آئیگا پہلا اسٹیشن اس وقت تک تو میری گاڑی ......

جی ہاں گاڑی تو آپ کی ضرور چھوٹ جائیگی مگر اب یہ بھی تو ممکن نہیں کہ آپ اس ریل کو واپس لوٹا سکیں یہ تو اب بہرحال لاہور ہی جائے گی۔ کیونکہ

میں نے اور بہت سے لوگوں نے وہیں کے ٹکٹ لئے ہیں۔ جمہوری حیثیت سے بھی آپ اپنے ایک ٹکٹ کے حق سے گاڑی واپس نہیں لیجا سکتے۔

آپ مذاق کر رہی ہیں اور میرے پیروں تلے سے زمین نکلی جا رہی ہے۔

زمین تو آپ کے پیروں تلے سے اسی وقت نکل گئی تھی جب آپ ریل میں بیٹھے تھے اب آسمان بھی سر سے گذرتا جا رہا ہے مگر آپ کچھ نہیں کر سکتے اور پہلا اسٹیشن آنے سے قبل کچھ کیا بھی نہیں جا سکتا۔

کتنی دیر کے بعد آئے گا پہلا اسٹیشن؟

ایک گھنٹہ بعد۔

اور پھر دوسری گاڑی مجھے کس وقت ملیگی؟

رات کو تین بجے

پھر اس کے مقابلہ میں تو یہی بہتر ہے کہ میں اس وقت اپنا سفر جاری رکھوں جب تک دہلی آنے والی گاڑی مجھے نہ ملے۔

یہ تو بڑا دانشمندانہ فیصلہ ہے اس نے مسکرا کر کہا۔

آپ کہاں جا رہی ہیں؟

میں تو پہلے عرض کر چکی ہوں کہ لاہور جا رہی ہوں۔

وہ بڑی حسین، شوخ اور حاضر جواب خاتون تھی۔ اس کے سفید سُرخی مائل چہرے پر بھورے رنگ کے ریشمی بال بکھرے ہوئے نہایت بھلے معلوم ہو رہے تھے اسکی آنکھوں کی نیلگوں پتلیوں میں محبت کے سمندر لہریں لے رہے تھے۔ اس کا مسکراتا ہوا حسن مجھے بہت ہی دلچسپ معلوم

ہو رہا تھا میں نے اس کی معیت کو بہت غنیمت خیال کیا اور اطمینان سے گفتگو کرنے لگا میری گاڑی کا وقت جس قدر قریب آتا جا رہا تھا۔ میں یہ فیصلہ کرتا جا رہا تھا کہ اس وقت تو جو کچھ بھی ہو میں لاہور ہی چلا چلوں۔

اگر میں لاہور ہی کا ارادہ کر لوں تو کیا برا ہے؟

بہت اچھا ہے منشی فاضل کا امتحان قریب ہے آپ بھی شریک ہو جائیے گا آدمی کو اپنی ہر غلطی سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانا چاہیئے۔

کیا آپ امتحان دینے جا رہی ہیں؟

جی ہاں میں اسی ارادہ سے جا رہی ہوں!

پھر میں بھی تقدیر آزما کر دیکھ لوں؟

ضرور بشرطیکہ قسمت پر اعتماد ہو۔

ابھی تک ایسا کوئی موقعہ نہیں آیا۔

اب دیکھ لیجئے اس نے انگڑائی لے کر کہا۔

آپ کو نیند آ رہی ہے۔

جی ہاں میں سونا چاہتی ہوں اس نے کتاب مجھے دیتے ہوئے کہا۔ آپ اس سے دل بہلائیے میں ذرا دیر کو سوتی ہوں۔

شکریہ! میں نے کہا اور کتاب لے کر میں شوق سے پڑھنے لگا تھوڑی دیر بعد ہی خاتون کو نیند آ گئی اس کی نیلی نیلی پتلیوں کو بنفشہ کے پھولوں سے زیادہ نیلگوں پتلیوں کو لمبی لمبی پلکوں نے چھپا لیا وہ تکیہ پر سر رکھے ہوئے سو رہی تھی کبھی کبھی گاڑی کی تیز رفتاری کے باعث ہوا کا

کوئی جھونکا ڈبہ میں داخل ہو جاتا اور اسکے باریک ریشمیں بالوں کو رخساروں پر منتشر
کر دیتا۔ یہ منظر ایسا ہوتا جیسے شام کے وقت آفتاب کو سنہری رنگ کے بادل چھپا لیا
کرتے ہیں۔ میں کتاب بھی دیکھ رہا تھا اور خاتون کے اوراقِ حسن کا مطالعہ بھی
کر رہا تھا۔ کتاب زیادہ دلچسپ تھی اسمیں متعدد مضامین تھے مجھے ان مضامین سے کیا دلچسپی ہوتی
ورق گردانی کے سلسلہ میں ایک نیلے رنگ کا کاغذ کتاب میں گر کر میرے
کمبل پر آ پڑا۔ میں نے اٹھا کر پھر کتاب میں رکھ دینا چاہا۔ لیکن اندازِ تحریر پہچانا
ہوا تھا۔ اگرچہ کسی کا خط بغیر اجازت کے پڑھنا اخلاقی جرم ہے مگر بعض اوقات
اخلاقی جرم میں بجد کشش پیدا ہو جاتی ہے اور کبھی اخلاقی جرائم کی تہ میں
کوئی اخلاقی تعلیم بھی پوشیدہ ہوتی ہے۔ میں نے پڑھنا شروع کر دیا یہ خط حسن
و محبت کی تباہ کاریوں سے متعلق تھا لکھنے والے نے اپنے سوزِ دل کی نمائش
کرتے ہوئے اشتیاقِ ملاقات ظاہر کیا تھا پڑھتے پڑھتے جب میں کاتب کے نام
پر پہنچا تو میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی میں چونک گیا ـــــــ ایک دام
میں دو شکار نہیں پھانسے جا سکتے۔ میں نے بلند آواز سے کہا یہ میرے
چھوٹے بھائی کا خط تھا جو عربک کالج دہلی میں پڑھتا تھا اسے اس خاتون
سے گہری محبت تھی جگہ جگہ جواب کا حوالہ بھی تھا جس سے معلوم ہوتا تھا
خاتون بھی اُسے پسند کرتی ہے اب ایک بڑا اسٹیشن قریب آ گیا تھا میں نے
خاتون کو بیدار کر کے کہا میں اجازت چاہتا ہوں!
کیوں آپ تو لاہور تک چلنے کا ارادہ کر چکے تھے۔
اب اس عزم کو توڑ دینا پڑا!

کس وجہ سے ؟

کیا بتاؤں کس وجہ سے ؟

آخر !

بس بغیر کسی وجہ کے فسخ عزیمت کرنا پڑی۔ یہ کہہ کر میں گاڑی سے اتر پڑا اب اسکی مسکراہٹ میں میرے لئے کوئی کشش نہ تھی یہ برق تبسم جس خرمن کو جلا چکی تھی میں اسکی فکر میں مبتلا تھا تھوڑے ہی دنوں کے بعد مجھے بمبئی پہونچکر اپنے بھائی کے خط سے معلوم ہوا کہ اس نے ایک تعلیم یافتہ اور حسین دوشیزہ سے شادی کرلی ہے میں فوراً سمجھ گیا وہ حسین دوشیزہ کون ہوسکتی ہے ؟

ڈاکٹر کا شب نامچہ

ایک نرس کا نیا نیا تقرر ہوا تھا۔ مجھے ہسپتال میں کام کرنے کا اصول اور بعض روزانہ پیش آنے والے واقعات کے متعلق ضروری باتیں اس کو بتانا تھیں۔ یہ میری ہمدردی اور حسن اخلاق کی گرویدہ تھی۔ میں نے شام کو ڈیوٹی ختم کرنے پر سائیکل اٹھائی اور چلتے وقت نرس کیطرف اس انداز سے دیکھا گویا میں اسے کوئی وعدہ یاد دلا رہا ہوں۔ اس نے قریب آکر پوچھا۔ ڈاکٹر میں کس وقت آؤں ؟

بس ڈیوٹی تبدیل کرکے آجانا !

۹ بجے تبدیل ہوگی ڈیوٹی۔

اسی وقت سہی!

آپ سو تو نہ جائینگے ۹ بجے تک؟

نہیں میں تو ۱۲ بجے تک جاگتا ہوں!

میرے گھر میں بوڑھی والدہ اور ایک چھوٹے بھائی کے سوا اور کوئی نہ تھا ابھی میری شادی بھی نہ ہوئی تھی۔ میں بہت ہی نیک، خوش اخلاق اور ہمدرد مشہور تھا۔ اور اس میں کوئی شک بھی نہیں کہ میں ایسا ہی تھا۔ یہ دوسری بات ہے کہ میری بعض رنگین راتیں اس خیال کی تردید کرتی ہیں اور واقعہ یہ ہے کہ میں دن کے لحاظ سے خوش اخلاق مشہور تھا۔ میری راتوں سے کسی کو کیا واسطہ؟ —— راتوں کی تخلیق تو ہوئی ہے بداخلاقی کے لئے، یہ تو ایک قسم کا پردہ ہے جو قدرت دنیا پر ڈال دیتی ہے۔ یہ آدمی کی بہت بڑی نیکی ہے کہ اس کا دن اچھے کاموں میں گذر جائے۔ ان فطری خواہشات کو پورا کرنے کے لئے جن کے مجموعہ کا نام "انسان" ہے اگر رات کا سیاہ پردہ ڈال لیا جائے تو اسے ایک آدمی کی عصمت اور شرم و حیا پر ہی محمول کیا جائیگا۔ میں کھانے سے فارغ ہو کر سیدھے اپنے کمرے میں آ گیا جسمیں بجلی کی روشنی تنویریں پھیلا رہی تھی لیکن روشنی بجلی کی ہو یا لیمپ کی اس کی ضیاء باہر کی دنیا پر پڑتی ہے۔ ضمیر اور روح کی اندھیری میں اس سے کوئی فرق نہیں آتا۔ اسی لئے میرا کمرہ روشن تھا مگر میرا ضمیر تاریک تھا۔ میں یہ سوچ رہا تھا کہ بجلی کی اس تیز روشنی میں مجھے اپنے نفس کے لئے ایک کام کرنا ہے۔ میری

مسہری جس پر گلابی رنگ کی جھالردار مچھردانی لگی ہوئی تھی اپنے سامان آرائش سے دل میں سوچتے ہوئے ارادوں کو گدگدا رہی تھی۔ سامنے رکھی ہوئی گھڑی آہستہ آہستہ اپنی موٹی سوئیوں سے وقت بتا رہی تھی اس کی ٹک ٹک اس وقت میرے سکونِ قلب کی حریف بنی ہوئی تھی اور میں چاہتا تھا کہ اس کی یہ آواز بند ہو جائے۔ بڑی مشکل سے گھڑی نے نو بجائے۔ یہ ایک گھنٹہ میرے خیال میں اتنا بڑا ہو گیا تھا کہ مجھے بار بار گھڑی بند ہو جانے کا شبہ ہوتا تھا۔ ٹھیک ۹ بجے ایک تانگہ دروازہ پر آ کر رکا اور میں سمجھ گیا کہ نرس آ گئی۔ جوان، حسین اور سادہ لوح نرس! جو ناتجربہ کار، اور ضرورت مند بھی تھی۔ اس کے لئے نوکری نہایت ضروری تھی۔ اور اپنی سادہ لوحی سے اس کو یقین ہو گیا تھا۔ کہ میری امداد کے بغیر ملازمت کا جاری رکھنا مشکل ہو گا۔ میرا دل دھڑکنے لگا اور زور زور سے اچھلنے لگا خوشی سے نہیں بلکہ اس جرم کے تصور سے جس کا ارتکاب میں کرنے والا تھا میں باہر نکلا۔ واقعی نرس ہی تھی خوبصورت ساڑی میں لپٹی ہوئی۔ اس کے گال ہلکے گلابی پھولوں کی طرح چمک رہے تھے۔ آنکھوں سے جوانی کا دیوتا جھانک جھانک کر مسکراتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ میں نے بڑے تپاک سے اس کا خیر مقدم کیا اور اپنے ساتھ کمرے میں لے گیا۔ میں صوفے پر لیٹ گیا۔ وہ ابھی کھڑی ہی تھی اور بیٹھنے کی جگہ تلاش کر رہی تھی میں نے کہا۔ بیٹھو اب تکلف کس بات کا یہ تو اپنا گھر ہے!

جی ہاں، یہاں آپ کے سوا میرا ہمدرد اور کون ہے؟

شکریہ، میں کس قابل ہوں بہرحال جس قابل ہوں ہر وقت خدمت کیلئے حاضر ہوں۔
مجھے آپ سے مل کر بڑا اطمینان ہو گیا ورنہ یہاں تو ہر شخص میرا دشمن نظر آتا ہے معلوم نہیں میں نے کسی کا کیا بگاڑا ہے۔ جگہ خالی تھی مجھے مل گئی میں نے کسی کو ہٹایا نہیں کسی کو نقصان نہیں پہنچایا پھر سمجھ میں نہیں آتا۔ میری مخالفت کیوں کی جا رہی ہے۔
نئی نئی جگہ ایسا ہی ہوا کرتا ہے۔ بات یہ ہے کہ ہر شخص تم پر اثر جمانے کی کوشش کرتا ہے مگر تم اطمینان رکھو۔ میں رفتہ رفتہ سب ٹھیک کر دوں گا واسطہ مجھ سے ہی پڑتا ہے سب کا، بات یہ ہے کہ آپ کی دعا سے صاحب میرے سوا وہ کسی کا اعتبار ہی نہیں کرتا۔
آپ کی عنایت میرے شامل حال رہی تو مجھے بھی امید ہے کہ آپ کی امداد سے میں اپنا کام نیکنامی کے ساتھ کرتی رہونگی!
ذرا آرام سے بیٹھئے، آپ تو بہت سمٹی سمٹائی بیٹھی ہیں!
نہیں میں بہت اچھی طرح بیٹھی ہوں!
چائے پئینگی آپ؟
نہیں ڈاکٹر صاحب شکریہ! یہ وقت نہیں چائے کا!
اور کچھ؟
بس کچھ نہیں، تکلیف نہ فرمائیے۔
میں چاہتا ہوں اس وقت آپ کو بہت سی باتیں بتا دوں مگر اس کے

لئے وقت کافی درکار ہے آپ کو جلدی تو نہیں۔ میری رائے میں تانگہ واپس کر دینا چاہیئے۔ دوسرا مل جائے گا۔ یہ سڑک بہت چلتی ہوئی ہے۔

ڈاکٹر صاحب میں ہر کام سے فارغ ہو کر آئی ہوں۔ رات اپنی ہے۔ تانگہ میں واپس کئے دیتی ہوں آپ مہربانی کر کے سب کچھ بتا دیجئے مجھ پر تو ایک پہاڑ سا ٹوٹ پڑا ہے۔ میری سمجھ میں یہی نہیں آتا۔ میں یہاں کام کیونکر چلاؤں گی؟

اِس کی فکر نہ کیجئے۔ میں سب ٹھیک کر دوں گا۔ اور میں تو ہر وقت یہاں رہتا ہی ہوں۔ جس بات کی تکلیف ہو آپ مجھی سے کہئے!

بس ایک آپ ہی کا سہارا ہے ڈاکٹر صاحب امتحان کی مدت بھی بڑی لمبی ہے۔ تین مہینے خیریت سے گذر جائیں۔ پھر تو میں ذرا مطمئن ہو جاؤنگی

آپ بالکل اطمینان رکھئے آپ کے خلاف کوئی بات نہ ہو سکے گی۔ میں کل ہی صاحب سے ان ساری دشواریوں کا تذکرہ کر دوں گا۔ وہ بہت رحمدل آدمی ہیں اور میں جانتا ہوں وہ سب کچھ میرے ہی سر رکھ دینگے دیکھ لینا پھر یہی کہدینگے۔ تم ہی ڈانٹ ڈپٹ کر دو۔ معاملہ میرے پاس نہ آئے اور تم دیکھ لو گی ہی ڈانٹ میں سب کے حواس ٹھکانے آجائیں گے!

ڈاکٹر صاحب، واقعی آپ بڑے نیک انسان ہیں۔ یہاں آپ نہ ہوتے تو مجھے ایک دن رہنا بھی دشوار ہو جاتا۔

شکریہ! ——— میں کس قابل ہوں۔ افوہ۔ دس بجا چاہتے ہیں۔

جی ہاں کیا ابھی کھانا نہیں کھایا آپ نے؟

نہیں، کھانا تو میں نے آج جلدی ہی کھا لیا تھا۔

پھر کہیں جانا ہے؟

جانا بھی کہیں نہیں۔ میں نے بدحواسی کیساتھ کہا۔ میں بار بار نرس کو للچائی ہوئی نگاہوں سے دیکھتا اور کچھ کہتے کہتے رُک جاتا۔ انگڑائیوں پر انگڑائیاں آ رہی تھیں۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ میری رگوں میں خون یک دم سے بہت زیادہ ہو گیا ہے۔ میرا چہرہ رفتہ رفتہ سُرخ ہوتا جا رہا تھا۔ اور سامنے والے آئینہ میں اپنے ان تغیرات کو میں اچھی طرح دیکھ رہا تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ میں جو کام کرنے والا تھا۔ اس میں کامیابی اور ناکامیابی کا یقین نہ تھا۔ وہ جتنا دلچسپ اور لطف خیز تھا۔ اتنا ہی خطرناک بھی ہو سکتا تھا۔ نیکدل اور معصوم نرس غور سے میری طرف دیکھ رہی تھی لیکن وہ ان تغیرات کو محسوس نہ کر سکتی تھی جو میرے جسم اور دماغ میں نہایت تیزی کے ساتھ ہو رہے تھے۔ میں نیکدلی کی سطح سے اُتر کر بدطینتی کی پستیوں کی طرف بڑھ رہا تھا اور بدترین کیڑے کی طرح سیاہ کاری کی کیچڑ میں رینگ رہا تھا۔ ایک مرتبہ میں نے نرس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے بچھونے کی طرف کھینچ لیا۔ اور مسکرا کر کہا۔

آپ آرام سے بیٹھئے آپ کی تکلیف سے مجھے اذیت ہوتی ہے۔ میرے گرم گرم ہاتھ جن سے غیر محسوس طور پر شعلے نکل رہے تھے، نرس کے ہاتھ کو لگے تو اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔ اب میرے منہ پر پاکیزگی کے نور کی کوئی جھلک دکھائی نہ دیتی تھی اس کی جگہ ایک سیاہی تھی نہایت وحشت خیز اور شرارت آمیز۔ میں مسکرا رہا تھا۔ میرے تبسم کی تہ میں شیطان کروٹیں

بدل رہا تھا۔ میں اب نرس کے بالکل قریب آگیا تھا وہ بار بار تعجب سے میری طرف دیکھ کر سر جھکا لیتی اس کا دل کانپ رہا تھا اور اس کی گردن کی رگیں اچھلتی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں رخساروں پر پسینہ کے شفاف قطرے دل کی دھڑکن کے ساتھ لرزتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ اس نے کہا ڈاکٹر صاحب ؟

کہئے ——— میں بولا۔

آپ کی طبیعت کچھ خراب ہو گئی کیا اس وقت؟

ہاں، تم بہت ذہین ہو۔ تم خوب کام کرو گی۔ واقعی اس وقت تم نے مجھ پر جادو کر دیا میں نرس کے بالکل قریب آگیا، اور اس کے چمکتے ہوئے رخسار پر آہستہ سے انگلی مار کر بولا۔ تم بڑی حسین ہو۔ دل کو تمہاری نگاہوں کے تیروں سے بچا لینا ممکن نہیں!

ڈاکٹر صاحب ہٹئے الگ۔ مجھے یہ باتیں پسند نہیں۔ دیکھئے میں بڑی بدنصیب ہوں۔ مجھ پر رحم فرمائیے!

رحم واقعی تم اسی قابل ہو اور میں بھی تو تم سے یہی استدعا کرنے پر مجبور ہوں۔ خدا کیلئے تم بھی رحم کرو۔ میں نے اسکی طرف جھکتے ہوئے لڑکھڑائی ہوئی آواز میں کہا۔ وہ ذرا تیز ہو کر بولی۔ ڈاکٹر صاحب یہ کیا؟ ذرا پرے ہٹئے میں کوئی عصمت فروش نہیں ہوں۔ دیکھئے مجھے ہاتھ نہ لگائیے۔ یہ کیا غضب ہے کہ ہندوستان میں ہر ایک خوددار عورت کو جو اپنی روزی آپ کمانا چاہے بدچلن اور بیشہ ور سمجھ لیا جاتا ہے۔

بیشک تم سچ کہتی ہو مگر میں ہاتھ کہاں لگا رہا ہوں۔ اُفوہ تمہارا دل دھڑک رہا ہے زور زور سے!

ڈاکٹر صاحب میں جاؤنگی مجھے نوکری اب نہیں کرنا چھوڑیئے مجھے۔ دیکھئے تو سہی آپ ڈاکٹر ہیں۔

اور تم نرس ہو —— نوکری نہیں کرنا تو شادی کرلو تم سب کچھ کرسکتی ہو —— میں تمہارے لئے ہر تکلیف برداشت کرنے کو تیار ہوں۔ اب تمہیں ہسپتال کا بڑے سے بڑا آدمی بھی نگاہ گرم سے نہیں دیکھ سکتا۔ میں آنکھیں نکال کر پھینکدونگا اس کی۔

لیکن ملازمت کی اتنی قیمت میں نہیں دے سکتی!

اوہ! —— جوانی میں یہ خشکیاں زیب نہیں دیتیں۔

ڈاکٹر صاحب ہوش میں آئیے۔ میں کوئی بازاری ....!

نہیں، نہیں، ہرگز نہیں میں نے تمہیں ایسا خیال نہیں کیا۔ مگر تمہارے دلربا ہونے میں کوئی شک نہیں۔

ڈاکٹر صاحب! —— نرس نے آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا۔ افسوس آپ مجھے لوٹنا چاہتے ہیں ——!

میں نرس کے سامنے بیٹھا ہوا معذرت کر رہا تھا اور وہ موٹے موٹے آنسوؤں سے رو رہی تھی اس کی آنکھیں اوپر نہ اٹھتی تھیں —— دیکھو میری گستاخی کو بخش دو۔ مجھے معاف کردو اور معذرت سے کوئی ملال دل میں نہ رکھو چلو میں تمہیں گھر پہنچا دوں، اور اگر یہیں رات گذارنا چاہو تو میں دوسرے

کمرے میں چلا جاؤں؟

مجھ سے نہ بولئے میں اس وقت اپنے حواس میں نہیں ہوں۔ میں اب گھر نہ جاؤں گی۔

اور کہاں جانا چاہتی ہو چلو میں پہنچا آؤں؟

میں اسٹیشن جاؤں گی۔

اور نوکری؟

نوکری شریف چوروں کے اتنے بڑے گروہ میں رہ کر میرے بس کی نہیں۔

کیوں بددل ہوئی جاتی ہو اتنی سی بات پر۔ کیا کسی اور نے بھی کچھ کہا تھا؟

میں کچھ نہیں کہنا چاہتی۔ مجھے اسٹیشن جانا ہے۔ میں ابھی جاؤں گی یہاں سے!

ایسا غضب نہ کرو۔ پچاس روپے کی نوکری پر لات کیوں مارے دیتی ہو۔

ایسی نوکری اسی قابل ہے۔ اچھا مجھے جانے دو، سامنے سے ہٹو۔ اسنے اپنی لال لال آنکھوں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

میں ایک طرف ہٹ گیا۔ پھر فوراً اس کے پیروں میں گر کر بولا۔ میری عزت آپ کے ہاتھ میں ہے۔ دیکھئے مجھے تباہ نہ کیجئے۔

اور میری عزت؟

میں قصوردار ہوں جو سزا آپ مجھے چاہیں دے لیں۔ ایسے جرائم کی سزا دنیا میں صرف ایک ہی ہوا کرتی ہے۔ میں اس کے لئے بالکل تیار ہوں۔

نرس صوفہ پر گر پڑی اور گھٹنے سمیٹ کر لیٹ گئی اور ہاتھ کہنیوں تک،

موڑ کر منہ کے دونوں طرف رکھ لئے اور سسکیاں بھرنے لگی۔

نوکری اس نے واقعی چھوڑ دی۔ مگر مجھے نہ چھوڑا۔ میں نے اپنے جرم کی سزا جو اس نے تجویز کی تھی خوشی سے قبول کر لی اور اب ہم دونوں ایک ہی جگہ رہتے ہیں اور جس حیثیت سے رہتے ہیں۔ اس کے اظہار کی ضرورت نہیں۔

دوشیزہ کا شب نامچہ

میں نے کسی کالج میں تو تعلیم نہ پائی تھی مگر کچھ دنوں ایک اسکول میں ضرور پڑھتی رہی تھی اور وہ بھی اس وقت جب مجھے جوانی یا نوجوانی کے متعلق اپنے محسوسات کا جائزہ لینے کا شوق نہ تھا یا یوں کہئے کہ شباب کا دیوتا جن رگوں میں سویا کرتا ہے اُس وقت فطرت نے ان رگوں کو چھوا ہی نہ تھا اس بنا پر میں نہیں کہہ سکتی کہ میں حسین ہوں یا بدصورت نوجوانوں سے ملنے کا اتفاق بہت کم ہوا ہے جو تھوڑا بہت ہوا ہے وہ یہ سمجھنے کے لئے بالکل ناکافی ہے کہ میرے چہرے میں کوئی کشش یا جاذبیت ہے یا نہیں۔ مگر سچ پوچھئے میں اپنے آپ کو بدصورت نہیں سمجھتی یہ دوسری بات ہے کہ دوسروں کی تو را اے مجھے معلوم نہیں جب آئینہ میں اپنی صورت دیکھتی ہوں تو نقش و نگار اور خط و خال میں اچھی خاصی دلکشی محسوس ہوتی ہے ممکن ہے میرے نقوشِ جمال اور رعنائیت دوشیزگی میں قلوبطرائیت نہ ہو جو دعوتِ التفات و ضیافت نظر کا سبب سمجھی

جاتی ہے بلکہ جاذب قلوب کا باعث بھی تاہم دلفریبی ضرور پائی جاتی ہے کم سے کم میرا دل تو آئینہ دیکھ کر ضرور مغرور ہو جاتا ہے۔ اگر پتلے پتلے مرجان کی طرح سرخ ہونٹ اور چھوٹے چھوٹے سفید چمکدار دانت پھر ہلکے گلابی اور ابھرے ہوئے گال جن پر کہیں کہیں نیلگوں تل بھی ہوں خوبصورتی کی جملہ خصوصیات میں داخل ہیں تو مجھے کون بدصورت کہہ سکتا ہے؟ پھر بھی یہ فیصلہ میری یا محض آئینہ کی رائے سے نہیں ہو سکتا اسی وجہ سے کبھی کبھی میں خود اس معاملہ میں مذبذب ہو جاتی ہوں، لڑکا ہو یا لڑکی جب ان میں سے کوئی اس مرحلہ کے قریب پہونچ جاتا ہے جو صنفی خواہشات کے محسوس کرنے یا ان سے متاثر ہونے کیلئے مخصوص ہے تو قدرتی طور پر دماغ میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ اس کی وابستگی جو بہر حال ضروری ہے کس کے ساتھ ہونی چاہئیے۔ اس سلسلہ میں بعض کے خیالات بہت وسیع ہوتے ہیں اور بعض کے ذرا محدود، مگر یہ واقعہ ہے کہ فکر و نظر کی آزادی سب چاہتے ہیں یعنی یہ منشا سب کا ہوتا ہے کہ ابتدائی اور آخری فیصلہ تنہا ان کی رائے سے ہو، ممکن ہے لڑکوں کو اس باب میں آزادی ہو مگر لڑکیاں بدقسمتی سے آزاد نہیں ہیں انھیں حق رائے دہی کا سرے سے حاصل ہی نہیں، انھیں جس کے سر منڈھ دیا جائے وہی اُن کا مقصود نظر ہے عام اس سے کہ وہ کالا ہو یا گورا، تندرست ہو یا بیمار جاہل ہو یا پڑھا لکھا میں اور خاندانوں کے متعلق تو کچھ نہیں کہتی میرے گھر میں ایسا ہی ہوتا آیا ہے دو سال پہلے ہی میری بڑی بہن کو جو چند

آفتاب وچندرے مہتاب نہ سہی تو قبول صورت ضرور تھی ایک ایسے شوہر
کے حوالے کر دیا گیا تھا جس کو انھوں نے کبھی اچھا نہیں کہا تھا اور حقیقتاً
اچھا تھا بھی نہیں، مگر ہندوستانی ذہنیت کے بزرگ لڑکی سے ہمیشہ یہی امید
رکھتے ہیں کہ وہ ان کے منتخب کئے ہوئے شوہر کو اتنا ہی پسند کرے جتنا
وہ خود اُسے پسند کرتے ہیں، اور انصاف سے دیکھئے تو ننانوے فیصدی
لڑکیاں اسی قسم کی ہوتی ہیں جو محض ماں باپ کی رضامندی اور اپنی آئندہ
زندگی کو خوشگوار بنانے کی خاطر "چار و ناچار ستی" بن جانا گوارا کر لیتی ہیں
اور عمر بھر اس غلط انتخاب کی مشتعل کی ہوئی آگ میں جلتی ہیں چنانچہ میری
بہن نے بھی ایک کالے، چیچک زدہ بھدّے اور بدصورت نوجوان سے
ایسی نباہی کہ سب تعجب کرتے ہیں اور کوئی تعجب کرے یا نہ کرے میں
ضرور کرتی ہوں سچ یہ ہے کہ خدا امتحان میں نہ ڈالے، مجھ ایسی لڑکی تو
کبھی اس قسم کی "خود کشی" اور "خود فروشی" کو جائز نہیں رکھ سکتی، پھر ان
حضرات خاندان کے معیارِ انتخاب میں نہ حسن و تندرستی کو کوئی دخل ہے
نہ اخلاق و انسانیت کو۔ بلکہ صرف کھانے پینے کی اہلیت اور معمولی سی زمینداری
یا تجارتی کاروبار پر اس کی بنیاد قائم ہے اور بس، میری عمر اب چودہ سال
سے متجاوز ہو چکی ہے۔ میرے دماغ میں اس قسم کے خیالات کا پیدا ہونا اور
دل میں ان تمناؤں کا ابھرنا ضروری ہے جو منزلِ زندگی سے قریب یا دور
کا تعلق رکھتی ہیں۔

میں تصور کی آنکھوں سے کچھ دھندلے اور مختلف نقوش دیکھ کر شوہر کا

جو مجسمہ اپنے دماغ میں تیار کیا کرتی ہوں، وہ ہمیشہ اس قسم کا ہوتا ہے — ایک تندرست اور حسین نوجوان جس کے ہونٹوں پر ہر وقت تبسم کھیلتا رہتا ہے، دل میں جذبات ہیں، امنگیں ہیں اور بیوی سے محبت بلکہ عشق کرنے کی پوری صلاحیتیں موجود ہیں۔ گفتگو میں تہذیب، نرمی اور حلاوت ہے۔ مزاج میں ہلکی ظرافت اور حد درجہ نرمی ہے سختی اور خشونت بالکل نہیں، اتنی آمدنی ہے کہ بڑی عسرت اور بے فکری سے اس کے پہلو میں محبت، مسرت، اور لطف و نشاط کی فردوسی زندگی بسر کر سکتی ہوں، وہ گھر میں آتا ہے تو ہنستا ہوا اور جاتا ہے تو مسکرا کر مڑ مڑ کر مجھے دیکھتا ہوا اور نگاہوں سے خاموش مگر دل میں اتر جانے والے پیام دیتا ہوا۔ جب میں ایسا کوئی مجسمہ تیار کر کے رات کو پلنگ پر لیٹ جاتی ہوں تو تصور میں اتنی کھو جاتی ہوں کہ نیند میری آنکھوں میں آ ہی نہیں سکتی اکثر صبح ہو جاتی ہے اور دن کی روشنی نیند کی ان حسین اور شرمیلی پریوں کو بھاگ جانے پر مجبور کر دیتی ہے جو رات بھر میرے سر پر منڈلاتی رہی تھیں اور میں نے انھیں آنکھوں کی راہ سے دل میں اتر جانے کی اجازت نہ دی تھی، کل میں سونے کیلئے خوابگاہ میں گئی تو اتفاق کی بات ایک خط پر میری نظر پڑ گئی جو میاں کی میز پر لیمپ کے قریب ہی رکھا ہوا تھا میں نے اٹھا کر پڑھنا شروع کر دیا — بھائی جان! نوشابہ کے متعلق اب تک جتنے تذکرے ہو چکے ہیں ان سب میں فہیم کا ذکر بہتر ہے اگرچہ دیکھنے میں لڑکا اچھا نہیں، مگر کھاتے پیتے گھر کا بچہ ہے بقدر ضرورت پڑھا لکھا بھی ہے اور شریف لڑکیوں کے شریک زندگی میں جو اوصاف ہونے چاہئیں سب اس میں

موجود ہیں، ـــــ گویا حسن یا مردانہ وقار و شان کا وصف شریف لڑکیوں کے شوہر کیلئے بالکل غیر ضروری ہے، یہ بتانے کی شاید ضرورت نہیں کہ نوشابہ میرا ہی نام ہے اور فہیم جس کے ذکر کو بہتر بتایا جارہا تھا میرے دور کے اعزہ میں ایک لڑکا ہے خدا جھوٹ نہ بلائے بالکل سیاہ رو، نہایت دبلا پتلا گالوں میں ایک ایک انچ کے غار پڑے ہوئے، آنکھیں چھوٹی چھوٹی اندر کو دھنسی ہوئی، نہایت منحنی، بہت کمزور، جیسے تیسرے درجہ کی دق کے مریض ہوا کرتے ہیں تعلیم نویں درجہ تک ہے۔ البتہ ایک زمیندار کے لڑکے ہیں، جن پر قرض نہ ہوتا تو جائداد کی آمدنی معقول تھی۔ یہ خط پڑھتے ہی میری رگ رگ میں تیزاب سا بھرا ہوا معلوم ہونے لگا دل میں آگ سی دہکنے لگی اور آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے ـــــ یا اللہ فہیم اور میرا شوہر بنے!! میں نے آہستہ سے کہا اور پلنگ پر جا پڑی، اور سوچنے لگی آخر یہ ان عقلمندوں کو کیا ہو گیا ہے کہ میرے لئے فہیم کو پسند کر رہے ہیں، شادی کے وقت انھوں نے بھی کوئی تمنا کی ہوگی اور میں قسم کھا کر کہہ سکتی ہوں کہ وہ تمنا صرف خوبصورت بیوی کی ہوگی۔ پھر ان مجرمان فطرت کو اتنا خیال نہیں آتا کہ عورت بھی تمنائیں کر سکتی ہے وہ بھی آرزو کی دنیائیں بسا سکتی ہے اور ان میں خوبصورتی کو بھی دخل ہو سکتا ہے۔ بھلا مرد حسین بیوی کی تمنا کر سکتا ہے تو عورت خوبصورت رفیق حیات" اور رنگین زندگی کی آرزو کیوں نہیں کر سکتی، وہ بھی تو دل رکھتی ہے اس کے سینہ میں بھی تو جذبات کا اُبال آسکتا ہے اس کے لہو میں بھی تو گرمی ہے۔ میں یہ تو کبھی یقین نہیں

کر سکتی کہ ماں باپ اپنی لڑکی کو ایسا جانور سمجھتے ہیں جسے ہری گھاس کھانے کو اور اچھی جگہ باندھنے کو مل جائے تو زندگی بسر کرنے کے متعلق اسکی کوئی ضرورت باقی نہیں رہجاتی مگر اس میں شک کرنیکی کوئی وجہ نہیں کہ چچا جان نے مجھے ایسا ہی سمجھ لیا تھا اور انھوں نے فہیم کے سارے عیوب محض اس وجہ سے نظر انداز کر دئے تھے کہ وہ کھاتا پیتا تھا اس کے پاس رہنے کو اچھا مکان تھا۔ اسی الجھن میں صبح ہوگئی بار بار فہیم کا ڈراؤنا چہرہ میرے سامنے آجاتا اور میری روح اس طرح لرز کر رہجاتی جیسے پنجرے میں قید کیا ہوا پرندبلی کو دیکھکر پھڑپھڑانے لگتا ہے، دھوپ نکلنے سے پہلے ہی میں اپنے معمولی کام کاج میں مصروف ہوگئی دل تو چاہتا تھا کہ پڑی رہوں، منھ ہاتھ بھی نہ دھوؤں بس اپنی قسمت کے اس تاریک اور بھیانک فیصلہ پر پڑی ہوئی آنسو بہاتی رہوں مگر یہ کسی طرح بھی ممکن نہ تھا بظاہر تو میں اپنے کاموں میں لگی ہوئی تھی اور حال یہ تھا کہ دماغ ایک منٹ کے لئے بھی فہیم اور نوشابہ کے عنوان سے نہ ہٹتا تھا مجھ سے دوپہر کا کھانا بھی اچھی طرح نہ کھایا گیا صبح کو ناشتہ تو میں نے بالکل ہی کیا تھا آپ جانیں جائے نہ پینے سے آدمی ویسے ہی بیمار معلوم ہونے لگتا ہے پھر جو واقعی بیمار ہی ہو۔ اس کا کیا حال ہوگا دو تین دن کے اندر ہی میں گھل گھل کر آدھی رہگئی اماں نے بھی محسوس کیا اور میاں نے بھی دیکھا۔ افسوس ہے کہ دونوں نے ظاہری آنکھوں سے دیکھا۔ دل کی آنکھیں کسی کی نہ کھلیں حقیقت کو کسی نے نہ سمجھا۔ بس مجھے بیمار سمجھکر طرح طرح کے سوالات کرنے لگے، میں سنتے سنتے تنگ آگئی اور جواب کے

لئے مجھے صرف تنگ ہی نہیں کیا جانے لگا بلکہ واقعی ستایا جانے لگا تو ایکدن میں نے اماں کو لکھکر دیدیا کہ فہیم مجھے آنکھ نہیں بھاتا! وہ یہ تحریر دیکھتے ہی دنگ رہ گئیں ایسا معلوم ہوا کہ زمین و آسمان اُنھیں ہلتا ہوا نظر آرہا ہے آخرکار میاں کے کانوں تک بھی میری بغاوت کے یہ الفاظ پہنچ گئے اگلے دن دونوں مجھسے خفا تھے، سخت برہم اور آزردہ گویا مجھ سے کوئی بڑا سخت جرم ہوگیا ہے، کوئی یہ کہنے والا ہی نہ تھا کہ پردہ میں بیٹھنے والی ان بے زبان اور معصوم لڑکیوں کو بھی مذہب اور اخلاق نے شادی ایسے اہم معاملہ پر اپنی آزادی رائے کو کام میں لانے کا حق دیا ہے اور اپنے کسی حق کو مانگنا یا تھے استعمال کرنا نہ بغاوت میں داخل ہے نہ جرم کا اس پر اطلاق ہوسکتا ہے میاں نے مجھ سے بولنا چھوڑ دیا، اور اماں نے تو یہاں تک کہدیا کہ نوشابہ تو لڑکی نہیں ناگن ہے کاش تو میری کوکھ سے پیدا نہ ہوئی ہوتی اور میں نے تیری جگہ کوئی پتھر جنا ہوتا!

کیوں اماں جان کیا قصور ہوگیا مجھ سے میں نے سہمی ہوئی آواز میں پوچھا۔ کم بخت ناشدنی کہیں کی مجھ سے پوچھتی ہے کیا قصور ہو گیا اتنی خودسر ہوگئی تو ہماری باتوں میں دخل دینے لگی، آخر تیرے نام کی شرم کیا ہوئی ہوتے ہی نہ مرگئی تو بے شرم کہیں کی! معلوم نہیں یہ آسمان کس کے بھاگوں اٹکا ہوا ہے!

میں سمجھ رہی تھی یہ کس بات پر اتنی آپے سے باہر ہو رہی ہیں۔ مگر میں نے اس وقت کچھ کہنا اچھا نہ جانا اور منھ لپیٹ کر پڑی رہی لیکن یہ سوچتی رہی

آخر ہو گا کیا انھوں نے میری بات نہ مانی اور فہیم کو سونپ دیا تو میں کیا کروں گی ؟ ــــــ مگر ایسی صورت میں جب میں نے انھیں وقت سے پہلے خبردار کر دیا ہے وہ میرا خیال معلوم کرنے کی بھی تو کوشش کریں گے ؟ ــــــ لیکن یہ پہلے بھی ان کا فرض تھا - پھر جو شخص ایک مرتبہ اپنے فرض کو فراموش کر سکتا ہے وہ دوسری اور تیسری بار بھی ایسا کر سکتا ہے دیکھنا یہ چاہیئے کہ مجھے کہاں تک اپنے فرائض کا خیال رکھنے کی ضرورت ہے، ظاہر ہے کہ میں کسی ایسے لمحہ میں خاموش نہیں رہ سکتی جس میں میری موت وحیات کے متعلق کوئی قطعی فیصلہ ہونا قرار پایا ہو، مجھے اپنا کام کرنا چاہیئے - ادہر کی دنیا اُدھر ہو جائے میں اپنا خیال نہ تبدیل کروں گی میں جان بوجھ کر زہر کو تریاق نہ سمجھونگی، میں روشنی اور تاریکی میں فرق کروں گی، میں بچھو کو بچھو اور سانپ کو سانپ کہونگی اس سے مجھے کوئی نہیں روک سکتا، تھوڑی دیر کے بعد اماں نے پھر کہا، اور مجھے اچھی طرح جھنجھوڑ کر کہا ــــــ پھر تمہارے لئے کیا کوئی یوسف آئیگا مصر سے ؟

یوسف، کون یوسف اماں ؟ میں بولی

ارے کہتی ہے نا فہیم ناپسند ہے پھر بتا کسے پسند کرتی ہے تو ؟

اماں مجھ سے ایسی باتیں نہ کیجئے - میں نے روتے ہوئے کہا

دو تین ہفتہ تک میاں اور اماں دونوں مجھسے ناراض رہے میں بھی رنجیدہ اور ملول رہی اس عرصہ میں ایک اور نیا عنوان سامنے آگیا اور میرے خیال میں یہ بہر صورت بہتر تھا اگر خود مجھ سے کہا جاتا کہ فہیم کے مقابلہ میں تم ہی کسی

اور کو منتخب کرلو تو شاید نہیں یقیناً میں شریف ہی کا انتخاب کرتی، خوبصورت، تندرست، گورا رنگ، بڑی بڑی آنکھیں، باتوں میں ایک نوع کا رس اور میٹھا پن جس سے دل کی حلاوت ٹپکتی تھی، بتائیے اب مجھے اور کسی چیز کی ضرورت تھی، سب ڈرے ہوئے تھے مجھ سے پوچھا گیا نوشابہ تو بھی تو کچھ بول؟

مجھ سے کیوں پوچھا جاتا ہے؟

اور کس سے پوچھا جائے تو نے فہیم میں جو کیڑے ڈالدیئے تھے؟

میں کیوں ڈالتی کسی میں کیڑے، مگر خدا ہی ڈالدے تو کیا علاج؟ اور سب میں تو کیڑے نہیں ہوا کرتے!

پھر اس کا یہ مطلب ہوا کہ شریف سے تم رضامند ہو کیوں یہی بات ہے نا نوشابہ؟

ہاں یہی سمجھ لیجئے۔ میں نے مسکرا کر کہدیا اور خدا خدا کر کے اس کھاتے پیتے فہیم سے مجھے نجات ملی، اب میں سوچتی ہوں کہ اس وقت غیر ضروری حجاب اور بزدلی سے کام لیتی تو مجھے روٹی اور کپڑے کے معاوضہ میں فہیم جیسے کالے کلوٹے، بیمار انسان کے سپرد کردیا جاتا، دیکھئے اب کس غریب کی قسمت پھوٹتی ہے،

سیٹھ جی کا شب نامچہ

میں شہر میں بہت دولتمند مشہور ہوں۔ میرے پاس کتنی دولت ہے، یہ بتانے کی ضرورت نہیں بس یہ سمجھ لیجئے کہ ایک لاکھ سے کچھ اوپر میرا روپیہ صرف ادھا

میں پھیلا ہوا ہے جس کا سود ہر مہینے وصول ہوتا ہے، سونا۔ چاندی اور
جواہرات اس کے علاوہ ہیں، میں اپنے پرانے محل میں رہتا ہوں جو میرے
پردادا کے وقت کا ہے اور ایک تنگ سڑک کے چوراہے پر واقع ہے، سورج
ڈوبتے ہی میرے گھر میں جگہ جگہ تالے پڑ جاتے ہیں اور چراغ جلا دیئے جاتے
ہیں۔ میں ۹ بجے تک باہر بیٹھا ہوا بہی کھاتوں کی جانچ پڑتال کرتا رہتا ہوں
منیب جی سامنے بیٹھے مجھے مدد دیتے رہتے ہیں، اس کے بعد گھر میں چلا
جاتا ہوں اور رسوئی جیم کر لیٹ جاتا ہوں، میری پہلی بیوی کا سورگباش ہو چکا
ہے، منیب جی کے مشورے سے میں نے دوسری شادی کر لی ہے، اس وقت
میری عمر پچاس برس کی ہے سیٹھانی شکل سے انیس ۱۹ سال کی ہونگی، وہ بڑی
سندر ہیں، ان کا روپ دل کھینچتا ہے، پر کام دھندوں میں اتنی فرصت
نہیں ملتی جو دس بیس منٹ سیٹھانی کے پاس بیٹھکر میٹھی میٹھی باتیں کروں،
سیٹھانی کو بھی اس کا بڑا دکھ ہے، جب سے میں نے سنا ہے کہ شہر میں چوریوں
کی وارداتیں زیادہ ہو رہی ہے، رات کو بہت ہوشیار رہتا ہوں، اندر باہر
آٹھ دس آدمی سونے پر مقرر کر دیئے ہیں، ان میں میرے قدیمی نوکر چاکر
بھی ہیں اور دو تین آدمی نئے بھی ہیں، جن کو پہرہ دینے کیلئے رکھ لیا ہے، بندوق
بڑے لالہ جی کے وقت سے گھر میں ہے میں نے کبھی اُسے چلایا تو نہیں پھر بھی
دل کو ڈھارس رہتی ہے کہ کام کی چیز ہے وقت پر کام آئیگی۔ آج ۹ بجے سے
پہلے ہی گھر میں آ گیا، یہاں پکوان پک رہا تھا، اور کڑھائی چڑھی ہوئی تھی
سیٹھانی اپنے ہاتھ سے پوریاں بیل کر گھی میں چھوڑ رہی تھیں، چھن چھن کی چکنی

اور میٹھی آوازیں موسم کی بھینی بھینی ہواؤں کے ساتھ کانوں کو بہت بھلی لگ رہی تھیں، رسوئی کرنے بیٹھا تو بڑا سواد آیا، میں نے خوب پیٹ بھر کر کھایا اور ہاتھ دھونے کے بعد دھوتی سے منہ پوچھتا ہوا چوکے سے نکل آیا، صحن میں آتے ہی ایک بڑی سے ڈکار آئی جسے میں نے اپنی قوت ارادی سے اور بلند کر دیا، قریب کے گھر میں ڈکار کی آواز سنکر کوئی ہنسا، میں نے اس کی پرواہ نہ کی، سٹھانی کھا پی کر اور کپڑے بدل کر آئیں، ان کی رسیلی آنکھوں میں ساون کی بہاریں مچل رہی تھیں، ماتھے پر سیندور کا لال ٹیکہ چمک رہا تھا وہ آتے ہی میرے پلنگ پر بیٹھ کر بولیں، تمہاری آنکھوں میں نیند بھری ہوئی ہے، کیا ابھی سو جاؤ گے؟

سونا رونا کا ہے کا، رات بھر کروٹیں بدلنی پڑتی ہیں، اندھیری راتیں اس پر چوروں کا ڈر سارے شہر میں غل مچا ہوا ہے، کبھی تجوری کا خیال آتا ہے، کبھی دبی ہوئی اشرفیوں کا، کبھی اُس گہنے کا جو لوگ یاگ میرے گھر ڈال کر بے خبر ہو گئے ہیں، بس اسی سوچ میں رات بیت جاتی ہے!

اور یہ فوج جو بھرتی کر رکھی ہے یہ کس کام کی ہے؟

اپنا بوجھ آپ ہی اُٹھانا پڑتا ہے کوئی کسی کا نہیں ہوتا سٹھانی، پرماتما بُرا وقت نہ لائے کوئی پاس بھی نہ پھٹکے گا!

تم تو زبردستی اپنی آتما کو دکھی رکھتے ہو آدمی کو چاہیئے چار پہر کام کاج میں گذارے ایک دو پہر ہنسنے بولنے کیلئے بھی رکھے،

ہنسنے بولنے کو دل کہاں سے لاؤں میرا دل تو طرح طرح کے بوجھوں سے دبا ہوا ہے۔

زیادہ فکر کرنا ٹھیک نہیں، اس سے تندرستی کو گھن لگ جاتا ہے۔

فکر نہ کروں تو اور کیا کروں؟

ارے ہنسو، کھیلو، مزے اڑاؤ، سٹھانی نے مسکرا کر میری بغل میں گدگدی کرتے ہوئے کہا، میں نے دیکھا سٹھانی پر موسم کا اثر بہت زیادہ ہے، وہ باغ کی بے چین تتلی کی طرح جوانی کا رس چوسنا چاہتی ہیں، ان کی آنکھوں میں نشہ بھرا ہوا ہے جو مجھے بھی مست بنانے کا مطالبہ کر رہا ہے، میری جوانی فکروں کی بھاری سل کے نیچے دبی ہوئی ہے، مجھ پر ان باتوں کا اثر نہ ہوا، عمر کا فرق بہت اہم ہوتا ہے، میں پچاس سال کا بوڑھا اور سٹھانی انیس سال کی البھڑ لڑکی، میں نے پہلے ہی منیب جی سے کہدیا تھا، اونٹ کے گلے میں بکری باندھنا ٹھیک نہیں، انھوں نے میری ایک نہ سنی، وہ سمجھتے تھے روپے سے جوانی خریدی جا سکتی ہے اور میری رائے ہے کہ روپیہ ہمیشہ بڑھاپا ساتھ لاتا ہے، کچھ بھی ہو میں سٹھانی کے ساتھ جوانی کے راستہ پر دوڑنے سے مجبور ہوں، میں نے سٹھانی کی طرف کوئی توجہ نہ کی اور ان کے ہر اشارے کو اس طرح ٹالتا رہا، جیسے میں کچھ سمجھ ہی نہیں رہا، دیر تک سٹھانی میٹھی جمائیاں لیتی رہیں، آخر انھوں نے ایک انگڑائی لے کر اٹھنے کا ارادہ کرتے ہوئے کہا، تم تو ایسے پڑ رہے ہو جیسے دس بیس کوس کی منزل کر کے آئے ہو!

منزل تو نہیں کی مگر تھک اتنا ہی گیا ہوں جیسے چل کر آیا ہوں۔

اچھا تو میں جاتی ہوں

ہاں جاؤ،

رات بڑی اندھیری تھی، کالے بادل آسمان پر مست ہاتھیوں کی طرح دوڑتے پھر رہے تھے، بوندا باندی تو چوبیس گھنٹے سے جاری تھی، اس وقت ۱۱ بج چکے تھے، مینڈکوں کی ٹیں ٹیں اور جھینگروں کی سیٹیوں کے علاوہ اگر کوئی آواز آتی تھی تو وہ پانی بہنے کی دھائیں دھائیں تھی، پرنالوں سے پانی گر رہا تھا اور نالیوں میں تیزی کے ساتھ بہہ رہا تھا۔

سٹھانی کو گئے ہوئے دو گھنٹے ہو گئے ہیں، اتنی دیر جاگتا ہی رہا میرے نام کی نیند اڑ گئی تھی، ذرا آنکھ جھپکنے کے قریب ہوتی تو یہ شبہ ہوتا کوئی آہستہ آہستہ چل رہا ہے، یہ خیال آتے ہی چونک جاتا اور دل دھک دھک کرنے لگتا، ایک بجے کے قریب گھبراہٹ زیادہ ہوئی تو جی میں کہا چلو تجوری کو ہی دیکھ آؤں، پہرے والے آدمی اگر سو گئے ہوں تو انھیں جگا دوں، میں پلنگ سے اٹھا اور تجوری کے پاس پہنچ کر دیر تک کھڑا رہا، وہاں سے بلونتا کی کوٹھری میں گیا وہ پڑا بے خبر سو رہا تھا خراٹوں کی آواز کمرے میں گونج رہی تھی، میں نے زور سے کمر میں لات مار کر کہا، نشہ کر کے آیا ہے کیا آج میں تجھے سونے کی تنخواہ نہیں دیتا، سونا ہے تو گھر جا کر سو، وہ جلدی سے اُٹھ بیٹھا، اس کے کپڑے پانی سے بھیگے ہوئے تھے۔ گڑگڑا کر کہنے لگا، سیٹھ جی یوں ہی ذرا اونگھ گیا تھا، ابھی تو بیٹھا ہوا تھا۔

دیکھو اب آنکھ نہ جھپکے، اُسے ڈانٹ کر میں نے دوسرے آدمیوں کو ہوشیار کیا اور سب سے کہا جاگتے رہنا، رات بہت اندھیری ہے۔

میرے کمرے کے اوپر ایک کمرہ تھا اس میں میرے بوڑھے نوکر امیدا کا بڑا بیٹا دولتا سویا کرتا تھا، یہ اپنے گھر ہی کا لونڈا تھا اسی لئے میں اُسے گھر میں سُلا لیا کرتا تھا، بڑا مضبوط جوان تھا، اس کا چمکتے ہوئے سیاہ رنگ کا چہرہ پھر اُس پر ماتا کے گہرے گہرے داغ بڑے بھیانک معلوم ہوتے تھے، پھر موٹے موٹے بے ڈول ہونٹ، چوڑے چوڑے بھدے اور کھریا سے دانت غرض اس کی کوئی کل سیدھی نہ تھی، بس اتنی بات اچھی تھی کہ آدمی ذرا جی دار تھا، اور گھر کی حفاظت میں افریقہ کے کتے سے کم نہ تھا۔ میں اپنے کمرے کے پاس آیا اور اندر جانے کا ارادہ کیا تو ایکدم دل میں یہ بات آئی کہ لاؤ چلتے چلتے دولتا کو بھی جگاتا چلوں وہ نیند کا بڑا رسیا ہے، دن کو بھی سو جاتا ہے، بس جس وقت زینہ پر چڑھ کر اوپر پہنچا ہوں موسلا دھار مینھ برس رہا تھا، پانی کے شور میں کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی جس برآمدے میں وہ سوتا تھا، وہاں بوچھار بہت آتی تھی غالباً اسی وجہ سے وہ اس وقت اندر کمرے میں کواڑ بھیڑے پڑا تھا۔ میں اُس کے دروازے کے پاس پہنچ کر ارادہ کیا کہ کواڑوں کو دھکا دیکر کھول دوں کہ میرے کانوں میں کچھ ایسی بھنک پڑی جیسے ستھانی کسی سے آہستہ آہستہ باتیں کر رہی ہوں۔ میں نے جھری سے جھانک کر دیکھا، اندر کا سماں دیکھ کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے، ستھانی دولتا کی پائنتی بیٹھی تھیں اور بار بار اس کے منہ کی طرف جھک جھک کر کچھ کہتی تھیں، ذرا دیر بعد دولتا بھی اُٹھ کر بیٹھ گیا اور اس نے ستھانی کے گلے میں باہیں ڈال دیں، میرے پیروں تلے کی زمین نکل گئی

ہائے میں لٹ گیا، میں نے آہستہ سے کہا، مجھ میں ہمت نہ تھی کہ سٹھانی کے بال پکڑ کر گھسیٹتا ہوا لے جاؤں، اور دولتا کے دو لاتیں رسید کردوں، نہ وہاں کھڑے رہنے کی طاقت تھی، میرا خون رگوں میں کھول رہا تھا، دنیا پر جو اندھیری چھائی ہوئی تھی اسے میں اس اندھیرے کے مقابلہ میں ہیچ سمجھتا تھا، جو میرے گھر میں ہو رہا تھا، میں مال اور دولت کو چوروں سے بچا رہا تھا مگر عزت اور آبرو پر ڈاکے پڑ رہے تھے، چھاتی پر پتھر رکھ کر میں چلا آیا اور پلنگ پر لیٹ گیا، نہ کسی سے اپنا غم کہہ سکتا تھا نہ غصہ پی جانے کا حوصلہ تھا، عجیب مشکل میں پھنس گیا تھا، رات بھر کانٹوں پر لوٹتا رہا۔

ایڈیٹر کا شب نامچہ

۹ بجے رات سے پہلے مجھے کبھی گھر آنا نصیب نہیں ہوتا کہ کام کی کثرت اس کا سبب نہیں تھا بلکہ ہوتا یہ ہے کہ اِدھر اُدھر کے بےفکرے ایڈیٹر جن کے دفتروں میں سرے سے کوئی کام ہی نہیں ہوتا چٹوں پر خریداروں کے پتے لکھنے کے بعد آٹھ بجتے ہی اپنے اپنے ادارت خانوں سے اُٹھ کر میرے پاس آجاتے ہیں اور حقہ، پان، چائے وغیرہ کا دور شروع ہو جاتا ہے اس طرح دن بھر کی کوفت تو ضرور رفع ہو جاتی ہے مگر رات کی دلچسپیوں میں اسی نسبت سے کمی واقع ہو جاتی ہے۔ بیگم جن کا میں صرف شوہر ہی نہیں ہوں، عاشق بھی ہوں میرے انتظار میں پریشان ہوتی ہیں۔ اور انہیں

بیشتر بحیثیت تاک بناسپتی گھی سے پکے ہوئے کھانے کو کئی کئی مرتبہ گرم
کرنا پڑتا ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک ہی مرتبہ چولھے کے پاس ہو کر
آتش مزاج بن جاتی ہیں۔ چند بار ایسا ہو جائے تو سمجھ لینا چاہیے کہ نیاز
مند مدیر کی خیریت نہیں، بیگم سرِ شام ہی پذیرائی کے انتظامات شروع
کر دیتی ہیں اور جب وہ بیوی کا ملبوس اتار کر صحیح معنوں میں بیگم بن جاتی ہیں تو
یہ انتظار شدید ہو جاتا ہے۔ آپ شاید عورت کی اس فطرت سے واقف
نہ ہوں مگر میں ضرور جانتا ہوں کہ وہ جب اچھا کھاتی ہے تو دوسروں کی نگاہوں
سے مخفی رہنے کی کوشش کرتی ہے اور جب اچھا پہنتی ہے تو اسے دعوتِ
نظر اور ضیافتِ جذبات کی تمنا ستانے لگتی ہے اور وہ چاہتی ہے کہ اُسے
کوئی دیکھے، عصمت اس دعوت اور تمنا کو محدود کر کے شوہر کی ذات
پر ختم کر دیتی ہے اور خدا بچائے بے عصمتی کی بے حیائی سے وہ اس دائرہ
کو حد سے زیادہ وسیع بنا دیتی ہے۔ غرض نو بجتے بجتے بیگم صاحبہ انتظار
کا مجسمہ بن جایا کرتی ہیں بلکہ اکثر اوقات دروازے کے قریب ہی آ کر کھڑی
ہو جاتی ہیں۔ اور پیروں کی آہٹ پر کان لگائے رہتی ہیں۔ اس میں تو کوئی
شک نہیں کہ میں جذباتی آدمی ہوں، رومانیت کے عناصر بے چین بھی کم
و بیش میری خلقت میں شامل ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ جذبات بعد میں انہی
کا ایک نتیجہ حسین ہیں، رومانیت نہ ہو تو جذبات کی گرمی بھی پیدا نہیں
ہوا کرتی باوجود اس کے بعض راتیں مجھ پر ایسی گذری ہیں کہ میں دفتر سے
اتنا بدحواس آیا ہوں کہ بیگم صاحبہ کی رومانیت خیز تیاری اور ان کے شباب انگیز

حسن نے میرے اوپر کوئی اثر نہیں کیا اور دفتر کے افکار نے محبت کے جذبات کو بیدار ہونے بلکہ کروٹ لینے تک کا موقعہ نہیں دیا۔ جب سے نیم گرانی شروع ہوئی ہے یہ جنون اکثر میرے سر پر سوار رہتا ہے جب تک دفتر میں بیٹھا رہتا ہوں۔ انہیں الجھنوں سے واسطہ رہتا ہے۔ ایک طرف سے ایک صاحب آکر کہتے ہیں روشنائی ختم ہو رہی ہے اور کاپی کا کاغذ بھی نہیں رہا۔ دوسری طرف سے جناب منیجر صاحب آکر فرماتے ہیں۔ کاغذ قطعاً نہیں رہا۔ آج شام تک کاغذ مہیا نہ ہوا تو کل کا اخبار شائع نہ ہو سکے گا۔ اور کاغذ کے متعلق ہندوستان کا ہر اڈیٹر خواہ اس کا تعلق حشرات الارض کی قسم کے اڈیٹروں سے ہو یا ترقی یافتہ مدیران محترم سے اچھی طرح جانتا ہے کہ بازار کی وسعتیں اس سے تقریباً خالی ہیں اور ساری ضروریات کا انتظام تو میں کر دیتا ہوں مگر کاغذ کا مسئلہ ایسا الجھ جاتا ہے کہ اس الجھن کو گھر تک ساتھ لانے پر مجبور ہو جاتا ہوں۔ گھنٹوں بازار میں گھومنے پر بھی اچھا اور حسب دلخواہ کاغذ نہیں ملتا اور ایک دم کاروبار کے بیٹھ جانے کا اندیشہ سوہانِ روح ہو جاتا ہے جب اس حالت میں گھر آتا ہوں تو اکثر بیگم صاحبہ سے اچھی طرح باتیں بھی نہیں کر سکتا سیدھے اپنے کمرہ میں جا کر ستیہ گرہ شروع کر دیتا ہوں نہ کھاتا ہوں نہ پیتا ہوں نہ سوتا ہوں نہ بات کرتا ہوں۔ اس وقت بھی اس دیوانگی میں مبتلا گھر پہونچا رات ذرا اندھیری تھی ایک ہاتھ میں بیڑی لئے شہر کی اس بدنصیب گلی کو جس کے لئے ارباب بلدیہ کی نگاہ التفات مفقود ہی

نہ ہوئی تھی، طے کر کے گھر کے دروازے کے سامنے آیا تو بڑی کی چک اور پاؤں کی آہٹ نے میرے آنے کا اعلان کر دیا۔ بیگم فوراً دروازے پر آ کھڑی ہوئیں میں چوکھٹ تک پہونچا بھی نہ تھا کہ دروازہ کھل گیا اور صرف دروازہ ہی نہیں بلکہ ذرا دیر کے لئے میرے دل کی کلی بھی کھل گئی۔ بیگم گلاب کے تازہ پھول کی طرح متبسم ہو کر مجھ سے مخاطب ہوئیں۔ آج تو بڑی دیر کر دی؟

جی ہاں کاغذ نہیں ملتا بازار میں بڑی مصیبت ہے۔

پھر اب کیا ہوگا؟

کیا بتاؤں بیگم، یہ لڑائی ایک آفت ہے، ہٹلر برطانیہ سے نہیں بلکہ براہ راست مجھ سے لڑ رہا ہے۔

پھر کورے لٹھے پر اخبار چھاپنا شروع کر دیجئے نا انھوں نے مسکرا کر فرمایا۔

اخبار تو کورے لٹھے پہ کیا چھپیگا البتہ یہ ممکن ہے کہ کپڑے کی گرانی کے باعث آپ کو کورے لٹھے کی شلواریں پہننا پڑیں۔

میں تو کبھی نہ پہنوں گی۔ انھوں نے آنکھیں مٹکا کر کہا۔

عریاں رہنے کے مقابلہ میں تو شاید آپ اس کا پہننا گوارا کر لیں گی؟

ہاں نوبت یہاں تک پہونچ گئی تو مجبوری ہے۔ اچھا کھانا تو کھا لیجئے کھانا ہا ——— بیگم کاغذ کی کوئی تدبیر بتاؤ

کاش کھانے کی طرح کاغذ بھی ہمارے باورچی خانہ میں تیار ہو جاتا!

کرتا۔ اگر ایسا نہ ہو سکے تو کھانا چھوڑنا چاہیے!

یہ مصیبت یوں ہی قائم رہی تو مجھے تو دنیا ترک کرنا پڑیگی! سمجھیں آپ؟

نہیں یہ بات تو میری سمجھ میں نہیں آئی اور نہ آئے، ——— دنیا میں تو آخر میں بھی داخل ہوں۔

مبالغہ نہ سمجھئے تو میری دنیا ہی آپ ہیں!

گویا آپ مجھے بھی چھوڑ دیں گے؟

لیکن یہ نوبت اس وقت آئیگی جب خود میں ہی نہ رہونگا۔ اچھا بیگم کاغذ کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟

میری رائے کاغذ کے معاملہ میں تو کوئی وزن نہیں رکھتی البتہ سونا، چاندی، نیز اصلی و نقلی سونے کے متعلق آپ پوچھنا چاہیں تو میں عرض کروں!

مذاق رہنے دو بیگم، میں کاغذ کے متعلق سوچ رہا ہوں اور ہاں یہ تو میں بھول ہی گیا اگلی اشاعت کے مضامین بھی تو مکمل اور مرتب نہیں ہوئے۔ غضب ہو گیا۔ میں نے افتتاحیہ بھی نہیں لکھا۔

اچھا بس رہنے دیجیے یہاں اس دفتر کے کھولنے کی کیا ضرورت ہے آپ دن بھر کیا کرتے رہتے ہیں جو یہاں آکر یہ باتیں یاد آیا کرتی ہیں آپ کو، رات ان باتوں پر غور کرنے کے لئے نہیں ہے رات تو آرام کی خاطر بنائی ہے قدرت نے!

لیکن اڈیٹر قدرت کے اُن قوانین کا پابند نہیں ہوا کرتا۔ اس حد تک تو میں آپ کے خیال سے بالکل متفق ہوں کہ رات کو آرام کرنا چاہیئے مگر اس کو کیا کروں کہ آرام کا وقت ہی نہیں۔ جو وقت بیوی کے حصّہ میں آنا چاہیئے تھا اس پر کاتب اور منیجر نے قبضہ کر لیا، اس سے بھی کچھ بچا تو دفتر کی ضروریات اس پہ قابض ہو گئیں۔ بہتر صورت تو یہ تھی کہ اڈیٹر کے لئے شادی ہی ممنوع قرار دی جاتی یا عورتوں میں کتابت اور منیجری کی اہلیت پیدا ہو جاتی۔

جس دن یہ انقلاب پیدا ہو گیا اسی دن آپ کو اخبار بند کر دینا پڑے گا۔ پھر میں آپ کو اخبار نہ نکالنے دوں گی۔

اچھا تو کاغذ کے متعلق ابھی کوئی فیصلہ نہیں ہوا۔ اگر ہم اخبار کی تقطیع ذرا کم کر دیں تو ہماری یہ فکر کچھ نہ کچھ ہلکی ہو جائیگی۔

میں کہتی ہوں گھر میں اس قسم کی باتیں کرنے سے کیا فائدہ؟

آپ مطمئن رہیں بیگم، میں گھر بنانے کی باتیں کر رہا ہوں گھر اجاڑنے کی نہیں۔ بات یہ ہے کہ آج کل کاغذ خدا کی قسم بیوی سے بھی زیادہ گراں ہو گیا ہے۔

اونہہ جانے بھی دیجئے اس کاغذ کو!

بیگم کام کیونکر چلیگا پھر ہمارا، بات یہ ہے کہ میں نہ تو دواخانہ کھول سکتا ہوں، نہ مطب کر سکتا ہوں، نہ وکالت، اور مختاری کی اہلیت بھی میرے اندر نہیں۔ بس اڈیٹری میرے نصیب میں لکھی ہے اور یہ بغیر کاغذ کے

چل نہیں سکتی۔

جب بیگم نے دیکھا کہ مجھے کاغذ خولیا ہو گیا ہے تو وہ منہ لپیٹ کر پلنگ پر جا پڑیں گویا ہم اُسے خفا ہو گئیں اس وقت ان کی ناراضی کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ میرے دماغ پر اس سے زیادہ اہم باتوں نے قبضہ کر رکھا تھا۔ میں نے اخبار کی کاپی پڑھنے کی نیت سے اُٹھائی اور لیمپ کی روشنی تیز کر کے پلنگ پر بیٹھ گیا۔ اس سے فارغ ہوا تو افتتاحیہ لکھنے لگا۔ آج کا افتتاحیہ بھی خطرے سے خالی نہ تھا۔ اس کے بعد ذرا کمر سیدھی کرنے کو لیٹا تو معلوم نہیں کس وقت مجھے نیند آ گئی۔ سوتے ہی یہ معلوم ہوا کہ ایک بہت بڑے میدان میں کاغذ کے سلنڈر (رول) انبار لگے ہوئے ہیں۔ ہر انبار پر کسی نہ کسی ایڈیٹر کا نام لکھا ہے۔ ایک پر میرے نام کی بھی چٹ چسپاں تھی۔ اُسی وقت آسمان سے ایک بم گرا، اور کاغذ میں آگ لگ گئی۔ میرا کاغذ بھی آگ کے شعلوں کی زد میں آ گیا۔ میں شور مچاتا ہوا اُٹھ بیٹھا ——— دیکھنا میرے کاغذ کو بچانا! کہیں جل نہ جائے! بیگم میری آواز سنکر دوڑی ہوئی آئیں۔ اور بولیں۔ خدا کے لئے تم اتنی فکر نہ کرو۔ سوتے میں بھی کاغذ ہی کاغذ کی رٹ لگا رہے ہو، اچھا منہ دھو کر کھانا کھائیے!

کھانا یا کاغذ ——— بیگم کیا کھاؤں؟

یا اللہ یہ آپ کو ہو کیا گیا ہے؟

غرض آج کی رات کچھ ایسی بدمزگی سے بسر ہوئی کہ نیند بھی پوری نہ ہوئی جب سویا کاغذ کے متعلق کوئی نہ کوئی پریشان خواب دیکھ کر اُٹھ بیٹھا۔ خدا خدا کر کے صبح صادق کے وقت آنکھ لگی اور اس وقت کھلی جب سورج ابھی

طرح پھیل چکا تھا اور منیجر صاحب ایک اچھے کاغذ کا نمونہ لئے دروازے پر کھڑے زنجیر ہلا رہے تھے۔

شاعر کا شب نامچہ

میں بہت مشہور شاعر ہوں اور خوش قسمتی سے جوان بھی، میرا کلام ملک میں بےحد پسند کیا جاتا ہے مگر ایمان کی بات یہ ہے کہ اشعار سے زیادہ میرا گانا مقبول ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب میں تحت اللفظ پڑھنے کا ارادہ کرتا ہوں تو لوگ مجھ سے گا کر پڑھنے کی فرمائش کرتے ہیں، بعض صاحبان کی رائے کا فیصلہ ہے کہ میرا شعر اسی وقت تک شعر ہے جب تک میں اسے گاتا رہوں۔ کاغذ پر آنے کے بعد وہ کچھ بھی نہیں رہتا۔ مجھے اس سے بحث نہیں کہ یہ تنقید، محض میری مقبولیت اور ہردلعزیزی کے خلاف ایک حسد ہے یا حقیقت پر مبنی ہے، میں نے آج تک اپنے شعر کو کاغذ پر پڑھا ہی نہیں، دو کام مجھے سخت ناپسند ہیں ایک تو آئینہ میں منہ دیکھنا دوسرے اپنے چھپے ہوئے اشعار کو پڑھنا، اس لئے میں نہیں بتا سکتا کہ کاغذ پر منتقل ہو کر میرا شعر کس معیار کا رہ جاتا ہے۔ میں تو صرف یہ جانتا ہوں کہ جس مشاعرہ یا صحبت میں مجھے کچھ سنانے کا موقع مل جاتا ہے وہ زیر و زبر ہو جاتی ہے اور کوئی زبان ایسی نہیں ہوتی جس سے تحسین و آفرین کی صدائیں بلند نہ ہوتی ہوں۔ آپ ہی بتائیے اس سے زیادہ مجھے اور چاہیئے کیا؟ کاغذ پر آنے کے بعد میرا شعر کتنا ہی بے لطف اور بے معنی ہو جائے مجھے اس کا ملال نہیں جب تک میں پڑھتا رہتا ہوں اس وقت تک تو واہ وا اور

سبحان اللہ کا شور برپا رہتا ہے یہی کیا کم ہے۔ اس وقت اپنے کلام پر زیادہ گفت گو کرنے کا موقع نہیں، میں اپنا شب نامچہ لکھنے بیٹھا ہوں۔ اشعار پر تبصرہ کرنیکا ارادہ نہیں رکھتا۔

ایک لمبے سفر کے سلسلے میں مجھے ہندوستان کے ایک مشہور مقام سے گذرنا تھا جس کی اطلاع مقامی شعراء کو ہو چکی تھی۔ اکثر احباب استقبال کو اسٹیشن پر موجود تھے، اگرچہ یہاں دو تین روز سے زیادہ ٹھہرنے کا قصد نہ تھا مگر جلد ہی معلوم ہو گیا کہ میری روانگی کا مسئلہ تنہا میرے اختیار میں نہیں بلکہ اس کے فیصلہ میں اور بہت سی طاقتیں دخیل ہیں جن کے سامنے میں سپر ڈالنے پر مجبور ہوں۔ میرے قیام سے فائدہ اٹھا کر چند ارباب ذوق نے مجلس مشاعرہ بھی منعقد کی اور اگر میں یہ کہوں کہ مشاعرہ میرے ہی ہاتھ رہا تو یقیناً حقیقت کے خلاف نہیں۔ میں نے طرح میں جو غزل کہی تھی وہ تو کچھ یونہی سی تھی بات یہ ہے کہ شاعر کو قید و بند میں مبتلا کر دیا جاتا ہے تو روح القدس کی توجہ کم ہو جاتی ہے اور معانی کا فیضان اسی نسبت سے گھٹ جاتا ہے مگر جسقدر غیر طرحی کلام میں نے سنایا، اس نے میری عظمت کو سب سے تسلیم کرا لیا، مجمع بے اختیار ہو کر داد دینے پر مجبور تھا، لوگ اچھل اچھل پڑتے تھے بعض پر وجد طاری ہو جاتا تھا اور سر دھننے لگتے تھے۔ اس مشاعرہ کی خصوصیت یہ بھی تھی کہ عورتیں بھی شریک بزم تھیں، بعض خواتین نے اپنا کلام بھی سنایا اور گا کر سنایا۔ اوّل تو شعر، پھر موسیقیت دونوں نے مل کر لطف دوبالا کر دیا۔ مشاعرہ رات کو دو بجے کے قریب ختم ہوا۔ میں اپنی

جائے قیام پر چلا آیا۔ اگلے دن ایک دستی لفافہ میرے نام آیا، کھول کر دیکھا تو ایک شاعرہ کی تین غزلیں تھیں اور ایک مختصر سا خط جس میں انھوں نے مجھ سے سلسلۂ تلمذ پیدا کرنے کی بیتابانہ خواہش کی تھی۔ میں نے آدمی سے کہا، بیٹھ جاؤ، جواب لے کر جانا اور جیب سے فاؤنٹین پن نکال کر میں نے تقریباً بیس منٹ میں تینوں غزلیں بنا دیں بلکہ یوں کہئے کہ کہہ دیں یہ تینوں غزلوں کے چار یا پانچ شعر صحیح ہوں گے، باقی اشعار یا تو غیر موزوں تھے یا حد سے زیادہ شرمناک، میں نے اسی خط کی پشت پر لکھ دیا کہ میرا مخلصانہ مشورہ تو یہ ہے کہ آپ شعر گوئی ترک کر دیں جو چیز مردوں ہی کو مفید نہ ہوئی اس سے عورتوں کو کیا فائدہ پہنچنے کی اُمید ہو سکتی ہے اگر اس مشغلہ کو جاری رکھنا ہی مقصود ہے تو براہ کرم اصلاح کیلئے کسی اور کو منتخب کیجئے۔ مجھ میں یہ عیب ہے کہ میں مبتدی حضرات کو بھی اسی سطح پر دیکھنا چاہتا ہوں جس پر کہنہ مشق اساتذہ ہیں۔ یہ بات قوانین قدرت کے خلاف ہے، مسافر چلتے چلتے ہی منزل پر پہنچتا ہے۔ پر لگا کر تو اڑا نہیں جاتا مگر شعر کے معاملہ میں میرا یہی خیال ہے کہ شاعر پر لگا کر اُڑے اور جس کے پر نہ ہوں وہ شعر ہی نہ کہے جب پست درجہ کے اشعار میری نظر سے گذرتے ہیں سمجھتا ہوں کہ کہنے والا اس منصب کی اہلیت ہی نہیں رکھتا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یا تو اس کے اشعار کو محنت کر کے اپنی سطح کے برابر کرتا ہوں، اس صورت میں شعر میرا ہو جاتا ہے یا پھر بگڑ کر غزل پھاڑ دیتا ہوں، اگلے دن پھر لفافہ آیا، محترمہ نے اصلاح کا شکریہ ادا کیا تھا اور شام کے کھانے

پر مجھے مدعو بھی کیا تھا۔ یہ خط مجھے اس وقت ملا جب دعوت کا اہتمام ہو چکا تھا ورنہ میں نہ جاتا اس وقت انکار کرنا مناسب نہ تھا۔ ٹھیک ۸ ½ بجے تانگہ میں بیٹھ کر شاعرہ صاحبہ کے دولت خانہ پر پہونچا۔ ان کا مکان شہر کے باہر ایک خوشنما مقام پر واقع تھا، قریب ہی چھوٹا سا باغیچہ تھا، میں تانگہ سے اتر کر باغیچہ میں ٹہلنے لگا اور کارڈ اندر بھیجدیا فوراً ہی دو تین آدمی آئے اور مجھے مکان کے ایک آراستہ کمرے میں لے گئے میں آرام کرسی پر بیٹھ گیا اور کمرے کی آرائش پر دل ہی دل میں تنقید کرنے لگا، کمرے کی سجاوٹ میں حد درجہ حسن مذاق کا ثبوت دیا گیا تھا البتہ فرنیچر کی پوشش میں غیر ضروری تکلف برتا گیا تھا۔ جس میں تصنع نمایاں تھا۔ ابھی میں تنقید سے فارغ نہ ہُوا تھا کہ شمالی کمرے میں کسی کے چلنے کی آہٹ سنائی دی، میں سمجھا کوئی آرہا ہے اسلئے اُدھر متوجہ ہو گیا کوئی چل تو ضرور رہا تھا مگر آ نہیں رہا تھا، کمرے کا دروازہ میری کرسی کے قریب ہی تھا دروازے پر خوبصورت ریشمی پردہ لٹک رہا تھا جو ہوا کے نرم جھونکوں سے جھولنے کے انداز میں ہل رہا تھا، جیسے کوئی شراب کی مستی میں جھومتا ہو، میں پردہ پر نگاہ جمائے ہوئے تھا کہ آواز آئی۔ شکریہ! جناب شاغل صاحب، زحمت فرمائی کا شکریہ!

اور میں اس شکریہ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

خوب گویا دونوں شکریے مل کر ایک مطلع ہو گئے!

بلکہ حسن مطلع!

میری غزلوں پر آپ نے نہایت عمدہ اصلاح دی ہے

بجا ہے میری رائے میں خراب شعر پر عمدہ اصلاح نہ ہو تو وہ کسی کام کا نہیں رہتا
بالکل درست ہے لیکن کیا آئندہ اس سلسلہ کو جاری رکھنا آپ
پسند نہ کریں گے؟

خیال تو یہی ہے!
لیکن میں آپ سے باصرار عرض کرونگی کہ میری رہبری ضرور فرمائیے۔
اگر میں معذور نہ ہوتا تو ضرور تعمیل ارشاد کرتا۔
معذوری کیا ہے آپ کو؟
وہی جو لکھ چکا ہوں"!
میں اس کے لئے تیار ہوں کہ آپ میرے اشعار کو اپنی پسند کے
مطابق بنا دیا کریں خواہ وہ بالکل ہی بدل جائیں۔
اس صورت میں اشعار میرے ہوں گے آپ کے نہیں۔
میں آپ سے سمجھ کر لے لیا کروں گی
اس سے آپ کو کیا فائدہ ہوگا؟
کچھ نہ ہو میرا شوق تو پورا ہو جائیگا۔
اگرچہ میری رائے میں ایسا شوق بھی فضول ہے تاہم میں تعمیل
ارشاد کر دیا کروں گا۔

اچھا کھانا چنا جا چکا ہے اندر تشریف لے آئیے۔
میں اندر چلا گیا۔ دسترخوان پر نہایت پرتکلف کھانے چنے ہوئے
تھے۔ دو صاحب اور بھی شریک تھے۔ ایک تو شاعرہ صاحبہ کے دور

کے عزیز تھے دوسرے ان صاحب کے دوست تھے۔ خیریت سے دونوں
حضرات شعر و سخن سے اتنے نا آشنا تھے کہ نہ تو شاعرانہ انداز سے کھانا
کھا سکے نہ گفتگو میں حصہ لے سکے ان دونوں کی پشت پر ایک بڑا قد آدم
آئینہ لگا ہوا تھا جس میں کمرے کی بہت سی چیزوں کا عکس پڑ رہا تھا اور
میں تو اپنے کھانے کے طور طریق بہت صاف طریقہ سے دیکھ رہا تھا۔
ایک مرتبہ میں نے سر اُٹھا کر دیکھا تو آئینہ واقعی آئینہ بن گیا تھا اور ایک خوش
پوش نوجوان عورت شانوں پر بال بکھیرے کھڑی مسکرا رہی تھی۔
میں نے اس لئے آئینہ کی طرف دیکھا تھا کہ اپنے منہ کھولنے اور لقمہ چبانے
کے انداز کو اچھی طرح دیکھوں اگر اس میں کوئی حیوانیت ہو تو اُسے
بدلوں اور اس حسنِ اتفاق سے فائدہ اُٹھا کر اسی وقت اس کی مشق
بھی کر لوں مگر سامنے کا منظر دیکھتے ہی میں ہکا بکا ہو گیا۔ مجھ پر ایک ہیبت
سی طاری ہو گئی —— خوبصورت کتابی چہرہ، پتلے اور میٹھے ہونٹ
جیسے ترشے ہوئے لال مسکرانے میں دانت آب دار موتیوں کی طرح
چمک رہے تھے۔ آنکھیں مناسب حد تک بڑی تھیں اور ان سے
جوانی کی شراب چھلکی پڑ رہی تھی۔ یہ کھانا میرے لئے زہر بن جائیگا۔ میں
نے دل ہی دل میں کہا اور آئینہ پر نگاہیں جما دیں کھانے سے فارغ ہونے
کے بعد ارشاد ہوا کچھ سنائیے!

میں نے کہا نوٹ بک نہیں لایا۔

زبانی ہی کچھ فرمائیے!

اس وقت کچھ یاد نہیں آتا

پھر کچھ کہہ ڈالیئے نا! حکم دینے کے لہجہ میں کہا گیا۔

طرح دیجئے کوئی۔

میں طرح نہ دوں گی آپ ہی کوئی مصرعہ سوچکر فرمائیے۔

اچھا پہلے آپ سنائیے اس وقت تک ممکن ہے مجھے کچھ یاد آجائے۔

میرے اس کہنے پر تھوڑی دیر تک سکوت رہا پھر کھانسی کے خفیف جھٹکے کے ساتھ انھوں نے کہا۔ مطلع عرض ہے۔

ارشاد!

آج پہلی مرتبہ مجھے کسی شاعر کی پوری غزل پسند آئی ممکن ہے یہ میری مغلوب ذہنیت کا اثر ہو کہ میں ان کے ہر شعر کو اچھا سمجھ رہا تھا جبتک انھوں نے غزل پوری کی میں نے اُسی زمین میں چھ سات شعر کہہ لئے وہ پڑھ چکیں تو میں نے سنانا شروع کیا۔ وہ بہت متاثر ہوئیں اور انھیں میری بدیہہ گوئی پر سخت استعجاب ہوا۔ میرا زمانہ قیام اگرچہ طویل ہوتا جارہا تھا اور میں اکتا رہا تھا مگر اُس وقت میں نے سوچا کہ ابھی مجھے یہاں اور ٹھہرنا چاہئے مشاعرہ ختم ہوا تو انھوں نے چائے کیلئے اصرار کیا۔ وقت تو نہ تھا مگر میرا یہ اصول پر کہ ع   جب سے پلائے یار تو کیونکر نہ پیجئے۔

انکار نہ کر سکا۔

انھوں نے خود ہی چائے بنائی اور پردہ سے ہاتھ نکال کر پیالی میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا، نوش فرمائیے!

پردہ اُن کے یہاں رواج میں داخل نہ تھا، اس وقت نسوانی حجاب کا ایک کرشمہ تھا کہ وہ میرے سامنے بے پردہ نہ تھیں اور میری رائے میں یہی حجاب ہے کہ جو عورت کی فطرت کا خمیر ہے، چنانچہ جس قدر وقت گذرتا گیا اُن میں جرأت بے حجابی پیدا ہوتی گئی۔ حتیٰ کہ حیائے اُنھوں نے میرے مقابل بیٹھ کر پی، یہ دلچسپ اور کیف انگیز صحبت ایک پُر لطف پس منظر کے طور پر ہمیشہ یاد رہیگی، چلتے وقت انھوں نے بڑی گرمجوشی کے ساتھ مصافحہ کیا اور نہایت عاجزی سے کہا کل پھر تکلیف فرمائیے گا!

بڑی خوشی سے

پھر کھانا بھی یہیں کھائیے!

اتنا تکلف نہ فرمائیے!

کھانا تو تکلف میں شامل نہیں، روزانہ کھایا جاتا ہے۔

آپ کے نزدیک کھانا اگر بے تکلفی میں داخل ہے تو اتنی بے تکلفی میں پیدا نہیں کرتا۔

انھوں نے ایک قہقہہ کے ساتھ باغ کی سوتی ہوئی کلیوں کو جو آنکھیں بند کئے ہوئے سو رہی تھیں پیام بیداری دیا، اور تانگہ ناگوار کھڑکھڑاہٹ کے ساتھ روانہ ہو گیا۔ میں اپنے کانوں میں اس قہقہہ کی صدائے بازگشت اور دل میں شوق و اضطراب کی دھڑکنیں لئے اپنی قیام گاہ پر آگیا۔

میرے احباب نے اگلے دن مجھے روکنا چاہا اور میرے نہ رکنے پر انھیں کافی آزردگی بھی ہوگئی مگر ایفائے عہد کے لئے میں بڑے بڑے معرکے سر کرنے کا عادی ہوں۔ بہر حال میں چلا گیا۔ آج کھانے میں کوئی خاص تکلف نہ تھا لیکن اور ساری باتوں میں تکلفات کار فرما تھے۔ غازوں اور خوشبود سے لے کر لباس تک میں مغربی تصنع اس حد تک نمایاں تھا کہ خود میں باوجودیکہ جذبات سے مغلوب تھا، کچھ گھٹن سی محسوس کرنے لگا۔ بات یہ ہے کہ شاعر کو تصنع سے ہمیشہ نفرت ہوتی ہے۔ اگر شاعر تصنع سے کام لے تو وہ شاعر نہیں۔ مغربی اصول میں پان کھانا ناپسند کیا جاتا ہے لیکن اسی مقصد کے لئے لپ اسٹک سے ہونٹوں پر غیر فطری بلکہ ناگوار سرخی پیدا کرنے کی ایسی بھدی کوشش کی جاتی ہے جس سے ہونٹوں کی حلاوت، معصومیت اور خوبصورتی فنا ہو جاتی ہے اور اُن پر خون آشامی کے جذبات جھلک آتے ہیں اور تصنع بالکل کھل جاتا ہے۔ کھانے کے دوران میں جو گفتگو ہوئی وہ ضرور بے تکلفی کے ساتھ ہوئی پھر رفتہ رفتہ اس بے تکلفی میں اضافہ ہی ہوتا رہا۔ آج چائے کی جگہ قوی محرکات بلکہ منشیات کا انتظام تھا چنانچہ پانی مانگنے پر سوڈے میں ملا ہوا کوئی ایسا سیّال مجھے دیا گیا جسے میں نے کبھی پسند نہ کیا تھا، میں نے منہ بنا کر پوچھا کیا ہے اس میں؟

کچھ نہیں۔ ملازم نے مسکرا کر کہا۔

کھائی میں پانی مانگ رہا ہوں!

بہت اچھا اس نے نادم ہو کر خالص پانی دیا جسے میں نے ایک ہی سانس میں پی لیا۔ یہ اور بتادوں کہ میں نے تمباکو کھانے یا پینے کی بھی آج تک عادت نہیں ڈالی تھی۔ منشیات کا تو ذکر ہی کیا ہے البتہ چائے ضرور پیتا ہوں اور بہت زیادہ پیتا ہوں اگرچہ میں نے "شراب ممزوج" کے چند گھونٹ ہی پئے۔ مجھے پھر بھی دل و دماغ نے اسکی ناگوار کیفیات کے خلاف جہاد شروع کر دیا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ وہ مسلسل کئی گلاس پی گئی تھیں۔ کھانا کھا کر ہم بیٹھے تو ان پر اور تو کوئی نمایاں اثر نہ تھا لیکن ہنسنے اور گفتگو کرنے میں وہ پہلے سے زیادہ بیباک ہو گئی تھیں۔ اب ہم ایک ہی صوفہ پر بیٹھے مختلف اساتذہ کے کلام پر تبصرہ کر رہے تھے کبھی وہ شعر پڑھتیں اور میں کہتا کہ اس میں شاعر نے کونسی جدت اور حلاوت پیدا کی ہے کبھی میں کوئی شعر پڑھتا اور وہ اپنے خیالات اس کے متعلق ظاہر کرتیں۔ ایک مرتبہ انھوں نے شیفتہ کا یہ شعر پڑھ کر ے

شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ
اک آگ سی ہے سینہ کے اندر لگی ہوئی

مجھے غور سے دیکھا۔ میں نے کہا، میری رائے میں یہ شعر ہمارے لٹریچر کے اس حصہ میں شامل ہے جو ہمیشہ زندہ رہیگا اور زبان و ادب کے انقلابات اس پر موثر نہ ہوں گے۔ ایک شعر اسی مفہوم کا میرا سنئے

نہیں معلوم الفت کیا ہے لیکن یہ سمجھتا ہوں
نگاہیں ان سے ملتی ہیں تو دل ہاتھوں اچھلتا ہے (کوثر)

سبحان اللہ! یہ شعر بھی غیر فانی ہے۔

یہ ہو یا نہ ہو پہلا ضرور ہے۔

اس کی کیا وجہ ہے؟

یہی کہ اس میں ایک سادہ اور فطری جذبہ کا اظہار کیا گیا ہے۔ محبت اور چنگاری میں کوئی فرق نہیں اور چونکہ محبت کی چنگاری دل میں سلگا کرتی ہے جو سینہ ہی میں واقع ہے اس لئے شعر بالکل مطابق حال ہے کیا آپ کے سینہ میں بھی یہ شعلے کبھی بھڑکے ہیں؟

کیوں نہیں میرا سینہ تو اس لحاظ سے اچھا خاصہ "گلخن" ہے۔

اچھا! اسی لئے آپ کے اشعار میں سوز و گداز زیادہ ہے۔

ممکن ہے۔

ان کا چہرہ جس پر غازہ کا شوخ رنگ پہلے ہی سے شباب بکھیر رہا تھا، دہک اٹھا اور سونے کے ہار کا خوبصورت تعویذ جو سینہ پر لٹک رہا تھا مخصوص طریقہ پر ہلنے لگا۔ معلوم ہوتا تھا کہ ان کی دل کی حرکتیں بڑھ گئی ہیں، اور جذبات کا دھواں آنکھوں کو دھندلا کر رہا ہے۔ اس کے برعکس میری طبیعت بے کیف تھی۔ اگرچہ میں ایسے حسین مواقع سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھا لینا "شبابیات" میں داخل سمجھتا ہوں مگر حسن کے اصل جوہر کو ملمع سے چھپا دیا جائے تو کشش کہاں باقی رہتی ہے میں ملمع سے جتنا گھبراتا ہوں کسی چیز سے نہیں گھبراتا آخر مجھے وحشت ہونے لگی۔ خصوصاً جب انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ صنف قوی اور صنف لطیف کے معیار حسن کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے۔ مجھے ایسا محسوس ہونے لگا کہ میں سخت گرمی کے وقت کوئلوں

کی انگیٹھی کے پاس بیٹھا ہوا ہوں، میں نے کہا۔ نسوانی حسن کے معیار کا ٹمپریچر تو بلاشبہ آپ ہیں مردانہ حسن کا میں نے آج تک کوئی معیار نہیں سوچا اور جناب مردوں میں حسن ہوتا ہی کہاں ہے، لعل بدخشاں کا آگرہ کے سنگ سُرخ سے کیا مقابلہ!

نہیں، میں سمجھتی ہوں اس معیار کو آپ پورا کرتے ہیں۔

جی نہیں ——— میں تو شاعر ہوں، محبوب نہیں ہوں، شاعر کا خیال حسین ہو سکتا ہے، اگر وہ اپنے آپ کو حسین سمجھنے لگے تو یہ بڑی بھول ہے اچھا تو اب میں اجازت چاہتا ہوں!

انھوں نے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا، نہیں ابھی بیٹھئے آپ بہت دلچسپ انسان ہیں

معاف فرمائیے یہ محض آپ کا حسن ظن ہے۔

نہیں، بالکل واقعہ ہے۔

اگر یہ بات ہے تو میں اب قطعاً نہ بیٹھوں گا آپ نے یہ تبصرہ کر کے مجھے بہت محتاط بنا دیا۔ خدا حافظ!

ٹھہریئے شاغل صاحب، آپ کو میری جان کی قسم ذرا ٹھہریئے۔ جی نہیں خدا حافظ

معلوم نہیں، میری طبیعت میں کیسا جمود پیدا ہو گیا تھا غالباً یہ نتیجہ تھا اس تصنع کا جو میں نے ہر چیز میں محسوس کیا۔ اس کے بعد مجھے وہاں ٹھہرنا دو بھر ہو گیا۔ صبح ہوتے ہی میں نے روانگی کا اعلان کر دیا۔ اس اعلان میں لجاجت اور بیزاری کا جذبہ شامل تھا اسلئے کسی کو روکنے کی ہمت نہ ہوئی۔

دُلہن کا شب نامچہ

آج کی رات بڑی اندھیری تھی۔ اور ڈراونی بھی، راتیں جب چاند کی روپہلی روشنی سے محروم ہو جاتی ہیں، تو ان کا سہاگ لٹ جاتا ہے اور چہرے سیاہ پڑ جاتے ہیں مجھے اندھیری راتوں سے ہمیشہ نفرت رہی ہے۔ میں مسہری پر پڑی کروٹیں بدل رہی تھی ستارے آسمان پر چمک رہے تھے، اور رات پھر بھی اندھیری تھی جیسے بڑے گھر میں کوئی چھوٹا سا چراغ جلا کر رکھ دیا جاتا ہے اور اس کے ایک کونہ میں بھی اُجالا نہیں ہوا کرتا، یہی حال ستاروں کا تھا برسات کی کالی راتیں جگنوؤں کی چمک سے روشن نہیں ہوا کرتیں میں نے پڑے پڑے سوچا وہ دیر میں کیوں آتے ہیں دفتر میں اتنی رات گئے تک کام کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی۔ اس کے بعد میرے دل میں تیزی سے بہت سے خیالات آئے اور کالی آندھی کی طرح دل کی دنیا کو الٹ پلٹ کر کے چلے گئے کبھی کبھی میں ان خیالات سے شرما کر آپ ہی آپ آنکھیں بند کر لیتی تھی۔ مگر جو باتیں دل میں کسی چور راستہ سے آتی ہیں وہ آنکھیں میچ لینے پر بھی آتی رہتی ہیں میرے ساتھ یہی معاملہ ہوا میں جن باتوں سے شرما رہی تھی خدا جانے کس رستہ سے وہ دل کی کوٹھری میں آ رہی تھیں کہ آنکھوں پر ہاتھ رکھ لینے کے بعد بھی آتی رہیں ایک خوبصورت نوجوان جس کی رسیلی اور میٹھی آوازیں اکثر دن میں بھی کانوں میں آیا کرتی تھیں گھڑی گھڑی نگاہوں کے سامنے آ کھڑا ہوتا میں اُسے دیکھتی اور منہ پھیر لیتی، یہ میرے پڑوس ہی میں رہتا تھا اور مجھے

نہیں معلوم کہ اس انتہائی اور سناٹے کے عالم میں اس کا تصور کیوں میرے دل و دماغ پر چھانے کی کوشش کر رہا تھا میں سوچتے سوچتے اب اس فیصلہ پر پہنچ گئی تھی کہ اتنی دیر تک ان کا راتوں کو غائب رہنا کسی اور بات کی علامت ہے وہ کہیں جاتے ہیں —— ضرور جاتے ہیں انھوں نے میری محبت کو ٹھکرا کر کسی اور سے دل لگا لیا ہے پھر اب میں کیا کروں؟ میری رگوں میں بھی تو خون ہے۔ جوانی کی گرمی اور امنگوں سے بھرا ہوا خون! پھر میں کیا کروں؟ یہاں پہنچ کر میری آنکھیں جھپکنے لگیں میں نے چاہا اس سے آگے میں کچھ اور نہ سوچوں یہ بات میرے بس کی نہ تھی شرم کہتی تھی خیالات مکڑی کی طرح کچے دھاگوں کا جو جال بن رہے ہیں انہیں توڑ دے دل کہتا تھا یہ کچے دھاگوں کے جال نہیں ہیں جوانی کی آرزوؤں کے مضبوط تاروں سے بنے ہوئے ہیں۔ یہ کسی کے توڑے نہیں ٹوٹا کرتے بلکہ عورت اپنے شباب کی ساری رعنائیوں کو ساتھ لیکر خود ہی اس میں پھنس جایا کرتی ہے۔ میرا کلیجہ دھڑکا، میں نے مہندی سے رچا ہوا گورا گورا ہاتھ جس کی لمبی لمبی انگلیوں کے پوروؤں میں سونے کے چھلے پڑے ہوئے تھے سینہ پر رکھ لیا۔ اس سے مجھے کوئی تسکین نہ ہوئی، شدت کی پیاس میں پانی کے قطرے سے تسکین نہیں ہوا کرتی۔ آگ تو پانی ڈالنے ہی سے بجھا کرتی ہے میں نے ہاتھ جھٹک کر الگ کر دیا۔ اسی وقت دروازے کی زنجیر کسی نے کھٹکھٹائی تو وہ بچھے والے تختے میں اچھل کر کھڑی ہو گئی۔ شاید آ گئے! میرا کلیجہ پھر دھڑکا اور زنجیر بھی پھر کسی نے کھٹکھٹائی وہی ہوں گے چلوں، کواڑ کھول دوں! اور

جو کوئی اور ہوا زنجیر کھٹکھٹانے کا انداز ان کا سا نہیں ہے اور کون ہو گا؟ میں چلی
آہستہ آہستہ پاؤں رکھتی ہوئی میرے پاؤں کے تلووں اور انگلیوں پر بھی مہندی
کی سُرخی نمایاں تھی جو کالے سلیپر سے نکلے ہوئے حصّوں پر کبھی کبھی مجھے بھی نظر
آجاتی تھی۔ میں کواڑوں کے پاس پہنچکر ذرا ٹھٹکی پاؤں کی آہٹ اور سلیپروں
کی چٹ چٹ نے زنجیر ہلانے والے سے کہدیا تھا میں آگئی ہوں۔ اس کے سانس
کی آواز میرے کانوں میں آرہی تھی۔ میرے سانس کی آواز بھی اس کو پہنچ رہی
ہوگی اس نے پھر زنجیر ہلائی۔ میں نے کواڑ کھول دیئے فوراً ہی معلوم ہوا وہ نہیں
ہیں اور ہی پڑوس والا کشیدہ قامت، خوبرو گورا چٹا نوجوان ہے میں جلدی
سے کواڑ کی آڑ میں ہوگئی۔ اس نے کہا، بیگم میں کچھ کہنا چاہتا ہوں آپ سے
اجازت ہو تو کہوں؟

کہئے۔ میں نے مہین آواز میں جواب دیا۔

مسٹر فدائی نے آج شراب بہت پی لی ہے وہ بدر منیر کے کوٹھے پر مدہوش
پڑے ہوئے ہیں کہئے تو تانگہ پر لے آؤں!

شراب! میں دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ بولی وہ تو شراب نہیں پیا
کرتے!

بیگم آپ بہت بھولی ہیں مسٹر فدائی شراب نہیں پیا کرتے کس نے کہدیا
آپ سے؟ شہر کا بچہ بچہ جانتا ہے وہ پیتے ہیں اور بہت پیتے ہیں یہ ممکن ہے گھر
میں نہ پیتے ہوں اور جس کو گھر سے باہر پینے کے اچھے موقعے میسر ہوں وہ
بیوقوف ہے جو گھر میں پیئے آپ کو معلوم نہیں آپ بہت معصوم ہیں!

میں کچھ نہ کہہ سکی عادتاً میں نے اپنی انگلیاں چٹخانا شروع کر دیں رنج کے موقعہ پر میں یہی کیا کرتی ہوں اس نے آواز سُنکر کہا بیگم کیا میں نے آؤں اُنھیں؟

ہاں لے آئے!
مگر وہ بالکل بیہوش ہیں۔
کچھ بھی ہو اُنہیں یہاں آنا چاہیئے۔
اچھا تھوڑا سا پانی پلا دیجئے مجھے۔
بہت اچھا۔

میں نے کانچ کے سفید گلاس میں پانی بھرا اور اُس میں برف کا ایک ٹکڑا ڈال کر کواڑوں کی درمیانی درازسے باہر بڑھا دیا اس نے ایک ہاتھ سے میری کلائی پکڑلی اور دوسرے ہاتھ سے گلاس کو جھکا کر پانی پی لیا گلاس خالی ہو گیا مگر اس نے میری کلائی نہ چھوڑی اس کے ہاتھ سے کوئی چیز بجلی کی طرح نکل کر میرے ہاتھ کی رگوں میں داخل ہو رہی تھی میرے بدن کا رواں رواں کھڑا ہو گیا۔ میں نے ایک پھریری لی۔ اور آہستہ سے کہا چھوڑیئے!

بیگم کیونکر چھوڑوں، آہ تم پہ یہ ظلم!
ظلم، مجھ پر کوئی ظلم نہیں ہو رہا آپ میرا ہاتھ چھوڑیئے۔
نہیں بیگم بہت مظالم ہو رہے ہیں آپ پر!
اب وہ چوکھٹ پر پاؤں رکھ کر کھڑا ہو گیا میں اُسے دیکھ رہی تھی اور وہ

مجھے دیکھ رہا تھا کواڑوں کا پردہ درمیان سے اُٹھ گیا تھا اُس کی آنکھوں سے لپٹیں سی نکل رہی تھیں۔ میں نے کئی دفعہ نگاہیں اونچی کر کے اُسے دیکھا واقعی وہ بہت حسین تھا اب اُس نے میری انگلیوں سے کھیلنا شروع کر دیا تھا وہ میری انگوٹھی کو جس میں یاقوت کا خوبصورت نگ جگمگا رہا تھا، گھما رہا تھا۔ میں نہیں بتا سکتی میرے جذبات اور دل پر اُس کا کیا اثر ہو رہا تھا، میں بالکل از خود رفتہ ہو گئی تھی مجھے آنکھوں سے کچھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ دل اتنے زور سے دھڑک رہا تھا کہ شاید وہ اچھی طرح سن رہا ہو۔ میں دو قدم پیچھے ہٹ گئی وہ میرے ساتھ اور آگے آ گیا۔ اب وہ میرے گھر کے اندر آ گیا تھا اُسے کوئی خوف نہ تھا۔ وہ بالکل مطمئن نظر آ رہا تھا، میں ضرور ڈر رہی تھی اور میرا رواں رواں کانپ رہا تھا، گھر میں ایک غیر مرد کی موجودگی سے مجھے کچھ شرم بھی آ رہی تھی لیکن بار بار مجھ پر بیہوشی کا سا ایک دورہ پڑتا تھا اور مجھے کچھ یاد نہ رہتا تھا کہ میں کہاں ہوں اور کیا کر رہی ہوں۔

اُس نے کہا بیگم آپ اجازت دیں، تو میں کچھ دیر کو بیٹھ جاؤں۔ میں نے کوئی جواب نہ دیا وہ میرا ہاتھ بغل میں دبائے بڑے اطمینان سے آگے بڑھا اور میری مسہری پر بیٹھ گیا مجھے بھی اس نے کھینچکر اپنے قریب بٹھا لیا بہت دیر تک وہ مجھ سے میٹھی میٹھی باتیں کرتا رہا۔ اور میں نہیں کہہ سکتی اس نے ذرا سی دیر میں میرے دل کی کائنات پر کیونکر قبضہ جما لیا تھا

قبضہ کرلیا پون گھنٹہ تک وہ بیٹھا رہا پھر اٹھا اور مجھ سے رخصت ہو گیا۔

اس کے جانے کے بعد میں نے کواڑ بند کر دیئے اور مسہری پر آنکھیں بند کر کے لیٹ رہی ایسا معلوم ہو رہا تھا مجھے بیہوشی کی کوئی دوا سنگھائی گئی تھی اور اب رفتہ رفتہ میرے حواس اس کی گرفت سے آزاد ہو رہے تھے۔ میں سوچ رہی تھی یہ کیا ہو گیا؟ اندر سے کوئی کہتا تھا کچھ نہیں ہوا وہی ہوا جو جوانی میں ہوا کرتا ہے — آہ میں لٹ گئی —

ذرا دیر گذرنے پر اُنہوں نے کواڑوں پر دستک دی میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا آج وہ واقعی پیئے ہوئے تھے ان کے بکھرے ہوئے بالوں، لال لال آنکھوں اور پسینہ میں ڈوبے ہوئے کپڑوں سے صاف معلوم ہو رہا تھا وہ قابو سے باہر ہیں آتے ہی وہ پلنگ پر گر گئے اور صبح تک انہیں خبر بھی نہ ہوئی میں کہاں ہوں اور کیا کر رہی ہوں صبح مُنہ دھو کر اُنہوں نے مجھ سے پوچھا رات کیا ہوا تھا؟ میں نے کہا مجھے کیا خبر!

بولے کسی نے یہاں آکر کچھ کہا تو نہیں

کیا آپ نے کوئی چیز منگائی تھی؟

اچھا ہوا کسی نے کچھ نہیں کہا مجھ سے بڑی حماقت ہو گئی تھی کل۔

کیا حماقت ہو گئی تھی؟

کچھ نہیں ہر بات بتانے کی نہیں ہوا کرتی، خدا جانتا ہے ہم دونوں اپنی حماقتوں کو کب تک دہراتے اور ایک دوسرے کو دھوکہ دیتے رہے۔

نوجوان کا شب نامچہ

میں نے اسکول سے نکلتے ہی گھر کی طرف چلنے کا ارادہ کیا کہ سینما کا چلتا پھرتا اشتہار آتا ہوا دکھائی دیا تماشہ تو اچھا ہے میں نے دل میں کہا رومانی بھی ہے اور رومان میری زندگی کا عنوان بن چکا تھا پھر کیسے دیکھوں؟ میں یہی سوچتا ہوا گھر پہنچا ابا بیٹھے چائے پی رہے تھے اماں چولھے کے سامنے پیڑھی پر بیٹھی پاپڑ تل رہی تھیں پاپڑوں کی سوندھی سوندھی خوشبو ناک میں پہنچتے ہی معدے میں اینٹھن شروع ہوگئی میں کتابیں میز پر ڈال کر ابا کی پائنتی آبیٹھا۔ انھوں نے کشتی میری طرف سرکاتے ہوئے آنکھ کے اشارے سے کہا پیو! میں نے ایک پیالی بنائی اور کرکرے پاپڑ کڑکڑ چبا کر ایک گھونٹ پیا جب پوری پیالی اور وہ پاپڑ ختم کرچکا تو پھر خیال آیا تماشہ بہت اچھا ہے ناچنے اور گانے والیاں نہایت مشہور ہیں سینما دیکھنے کو ابا سے کچھ مانگنا ایسا ہی تھا جیسے کنوئیں میں گرنے کے لئے اجازت طلب کرنا اور سچ بات یہ ہے ان کے پاس تھا ہی کیا جو میں اُن سے مانگتا اُن کی آمدنی کھانے

پینے کی چیزوں اور معمولی ضروریات کے مہیا کرنے ہی کے لائق تھی مہینہ ختم ہوتے ہوتے دس یا پانچ روپے کا قرض ہو جانا لازمی بات تھی یہ تو سب کچھ تھا مگر تماشہ دیکھنا ضروری تھا۔ آج کی فلم دیکھے بغیر میں کالج کے لڑکوں میں بیٹھنے کے لائق کیونکر رہوں گا صبح کو سب اس نئے فلم پر اپنے اپنے خیالات کا اظہار کریں گے۔ اور ناچ گانے پر تبصرہ ہوگا۔ میری خاموشی میری مفلسی اور جہالت کی آئینہ دار ہوگی۔ پھر میں سب کی نگاہوں میں ذلیل ہو جاؤں گا۔ فلم دیکھنی ضرور چاہیئے۔ میں نے پختہ ارادہ کر لیا اور تھوڑی دیر ادھر اُدھر ٹہلنے کے بعد میں نے گھر میں آکر ابا کی تمام شیروانیوں اور کوٹوں کی جیبوں کو ٹٹولا اتفاق سے ایک میلی شیروانی کی جیب میں چمڑے کا بٹوہ پڑا تھا اس میں دس دس روپے کے آٹھ نوٹ تھے میں خوشی سے اچھل پڑا رات کی تفریح کا انتظام ہو چکا تھا اس کے لئے ایک نوٹ کافی تھا میں نے ایک نوٹ نکال کر جیب میں رکھنے کا ارادہ کیا اور پھر سوچا ممکن ہے ان کے نہ ہوں کسی اور کے ہوں اور انھیں جلد ادا کرنے پڑیں واقعہ غالباً یہی تھا پھر کیا یہ چوری نہیں ہے اگرچہ میں ایک نوٹ اس میں سے لے سکتا ہوں لیکن اس کا نام چوری کے سوا اور کیا ہوگا میں جانتا تھا چوری اچھی نہیں اس سے انسان کی عزت باقی نہیں رہتی ضمیر مردہ ہو جاتا ہے مگر سوال تو یہ تھا اصل عزت وہ ہے جو کل کو کالج میں فلم کے متعلق لڑکوں کے مجمع میں تقریر کرنے سے مجھے حاصل ہوگی۔ یا یہ کہ اس وقت میں یہ دس روپے نہ لوں اور دل پر جبر کر کے چپ

ہو جاؤں میں نے معمولی غور و فکر کے بعد نوٹ بٹوے میں رکھدیئے مگر میں بار بار اندر سے باہر اور باہر سے اندر آتا جاتا رہا۔ شام کو ابا کہیں ٹہلنے چلے گئے۔ بٹوہ بدستور جیب میں پڑا رہا۔ کافی کشمکش کے بعد میں نے فیصلہ کر لیا۔ روپیہ لے لینے میں کوئی ہرج نہیں ہے یہ طے کر کے میں نے ایک نوٹ نکال لیا اور سر میں خوشبو دار تیل لگا کر دھلا ہوا سوٹ پہنا اور اماں سے کہا اماں آج میں دوستوں کے ساتھ باہر سیر کو جاؤں گا نو دس بجے تک آسکوں گا۔

وہ بولیں بیٹا بہت دور نہ جانا۔

نہیں اماں میں گنگا کے کنارے ریت میں جا کر بیٹھوں گا چاندنی رات میں وہاں ذرا لطف آتا ہے۔

گھر سے نکلتے ہی کالج کی ایک خوبصورت لڑکی جو اتفاق سے میرے ساتھ ہی پڑھا کرتی تھی مل گئی وہ خوبصورت ناگن کی طرح سڑک پر بل کھاتی جارہی تھی میں نے بھی اونچی ایڑی کے جوتے پر اسے چلتے بلکہ رقص کرتے ہوئے دیکھا میرا دل بے چین ہو گیا قریب آکر میں نے پوچھا مس شیلا کہاں چلیں؟

اس وقت شیلا کالج کی شیلا نہ تھی، اس کے ہونٹوں کی گہری سرخی اور منہ پر لگے ہوئے خوشرنگ اور خوشبودار غازہ نے اُسے معلوم نہیں کیا سے کیا بنا دیا تھا اس کے نرم اور سیاہ بالوں کا ایک گچھا حسین رخساروں پر لہراتا ہوا کانوں کے اوپر سے گزر گیا تھا اس کے حسین اور چمکدار آویزے

کانوں میں بہت بھلے معلوم ہو رہے تھے۔ اور پیشانی کے وسط میں سُرخی کا ایک لمبا نشان آتش فشاں پہاڑ کے شعلے کی طرح چمک رہا تھا شیلا نے نیم نگاہی سے مجھے دیکھا اور دلفریب مسکراہٹ کے ساتھ کہا آپ کہاں چلے؛ سینما؟

میں نے کہا ہاں!

میں بھی وہیں جا رہی ہوں

یہ حسن اتفاق خوب رہا۔

وہ جامنی رنگ کی پھولدار ساری کے پلو کو جس پر جوڑا سنہری گوٹا ٹکا ہُوا تھا شانہ پر پِن سے دباتے ہوئے بولی حسن اتفاق تو جب ہے کہ ہمیں جگہ بھی مل جائے،

جگہ کیوں نہ ملے گی؟

آج ہجوم بہت ہوگا ٹکٹ لینا بھی مشکل ہوگا۔ فلم کا اشتہار بہت ہوا ہے اور فلم ہے بھی بہت اچھی۔

تم اطمینان رکھو شیلا ٹکٹ میں لے آؤں گا۔

ہم باتیں کرتے اور سیمنٹ کی چکنی سڑک کو قدم قدم پر سینما ہاؤس بناتے ہوئے تماشہ گاہ کے قریب پہنچے تو شیلا بولی دیکھو کتنی بھیڑ ہے!

کیا ٹھکانہ ہے شیلا معلوم ہوتا ہے کوئی ہنگامہ ہو رہا ہے۔

اس بھیڑ میں تمہیں ٹکٹ گھر تک پہنچنا بھی مشکل ہوگا۔

کوشش تو ضرور کروں گا شیلا یہ کہہ کر میں بھیڑ میں گھس گیا اور بندرہ

بیس منٹ کی جان توڑ کوشش کے بعد کھڑکی تک پہنچا مگر کھڑکی بند ہو چکی تھی ٹکٹوں کی فروخت بند ہو گئی تھی میں بمشکل واپس ہوا شیلا نے یاس آمیز لہجہ میں کہا پھر کیا ہو اب؟

دوسرا شو دیکھیں گے شیلا چلو اتنی دیر پارک میں بیٹھیں!

—— بڑی دیر ہو جائیگی۔

ہو جانے دو۔ فلم تو ضرور دیکھنی ہے۔

ہاں میں بھی یہی سوچ کر آئی تھی۔

پھر آؤ اتنی دیر کا گذارنا کیا مشکل ہے؟

ہم دونوں ٹہلتے ہوئے پارک میں چلے گئے اور ایک خالی بنچ پر بیٹھ گئے بجلی کی روشنی شیلا کے حسین رخساروں کو نگاہیں پھاڑ کر دیکھ رہی تھی، سینٹ کی بھینی بھینی خوشبو سے میرا دماغ پھٹا جا رہا تھا میں نے شیلا کی ساری کے ایک پھول کو سونگھتے ہوئے پوچھا شیلا یہ خوشبو کہاں سے آرہی ہے؟

بڑے بھولے ہو نادہ شوخی سے بولی کپڑے کے پھول سے آگئی خوشبو؟

پھر کہاں سے آرہی ہے میں نے سادہ لوحی سے سوال کیا

بس رہنے دو آرہی ہو گی کہیں سے! اس نے ٹالتے ہوئے کہا۔

شیلا تم روز کالج سے آنے کے بعد بھی روپ دھارن کر لیا کرتی ہو؟

کیوں کوئی نئی بات پیدا ہو گئی میرے اندر؟

شیلا تم تو اس وقت معلوم نہیں کیا ہو۔ اس نے ریشمی دستی کو تھوڑی

ن کے نیچے دباتے ہوئے کنکھیوں سے مجھے دیکھا اور دیر تک دیکھتی رہی اس کی نگاہیں میرے سینہ کو چیر کر دل تک پہنچ رہی تھیں میرا دل کانٹے میں نبدھی ہوئی مچھلی کی طرح تڑپ رہا تھا دیر تک ہم پارک میں بیٹھے کیوپڈ اور سائکی کے افسانہ حیات کو دہراتے رہے۔ آخر دوسرے شو کا وقت آگیا میں نے دوڑ کر پہلے درجہ کے دو ٹکٹ لئے شیلا نے بٹوہ نکال کر مجھے روپے دینا چاہے میں نے انکار کر دیا۔

تماشہ ختم ہونے پر میں نے شیلا کو اس کے گھر تک پہنچایا پھر میں نے اپنے دروازے پر پہنچکر آواز دی اماں جاگ رہی تھیں اور کچھ پریشان معلوم ہوتی تھیں میں نے اندر پاؤں رکھا ہی تھا کہ اُنھوں نے پوچھا تم نے اپنے ابا کا بٹوہ تو نہیں کھولا تھا؟

نہیں اماں کیسا بٹوہ، کہاں رکھا تھا؟

شیروانی کی جیب میں تھا وہ بولیں۔ اسی روپے کے نوٹ تھے دس روپے کا ایک نوٹ کسی نے نکال لیا بہت خفا ہو رہے تھے تمھاری بہن کی شادی کے لئے کپڑا خریدنے کی غرض سے کسی سے قرض لائے تھے۔

میرے دل پر اب ان باتوں کا کیا اثر ہوتا وہ تو حسن و رعنائی کی رنگینیوں میں ڈوبا ہوا تھا روح میں نشتر سے چبھتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے میں بستر بچھا کر پلنگ پر لیٹ گیا اور شیلا آنکھوں کے سامنے چلنے پھرنے لگی۔ اس کے بعد میرا معمول ہو گیا روزانہ شام کو شیلا کے ساتھ سینما جانا کبھی کبھی ٹہلنے چلا جاتا، میں نہیں کہہ سکتا کہ میرے پاس سینما جانے اور دوسری

تفریحات کے لئے روپیہ کہاں سے آتا تھا۔ ایک مرتبہ میں نے جو راستہ اختیار کیا تھا۔ اُسے میں کبھی نہ چھوڑ سکا:

شوہر کا شب نامچہ

آج میری عمر کے چالیس سال پورے ہو رہے ہیں اکتالیس گذر جانے پر شادی کا حادثہ پیش آیا کسی ضرورت یا خواہش کی بنا پر نہیں بلکہ بوڑھے عزیزوں کے اصرار اور چند خاص دوستوں کے تقاضوں کیوجہ سے بیوی بھی اتفاق سے اچھی ملی یعنی جوان بلکہ دوشیزہ جس کو دیکھکر یہ شعر پڑھ دینا بالکل جائز ہے۔

برس پندرہ یا کہ سولہ کا سن
جوانی کی راتیں امنگوں کے دن

حُسن و صورت کے متعلق مجھ سے کوئی سوال کرنا اس لئے مناسب نہیں کہ میں حُسن پرستی کی دنیا میں "خضر طریقت" کا مرتبہ رکھتا ہوں اور اس سلسلہ میں بائیس تیئیس سال کے وسیع تجربہ کا مالک ہوں۔ سچ یہ ہے کہ اس باب میں مجھے کچھ کہنا سننا پسند نہیں اگر کچھ کہا جاسکتا ہے تو صرف جوانی کے متعلق ورنہ جمال و رعنائی کے بارے میں وسعت نظر کا یہ حال ہے کہ آفتاب و ماہتاب بھی سامنے رکھدیئے جائیں تو شاید نگاہ میں نہ جچیں۔ اس مشکل پسندی کے باعث تعریف جمال کا نظریہ ہی میں نے بدل دیا چنانچہ میرے

خیال میں جوانی کا نام ہی حسن ہو گیا ہے یعنی مکمل حُسن دستیاب نہ ہو سکا تو میں
نے صرف شباب اور اسکی رعنائیوں کو نیز عشوہ ہائے بے نام کو حسن قرار دے
لیا اس نقطۂ نظر سے اپنی بیوی بھی مجھے ناپسند نہ تھی یہ بتانا میرے فرائض
سے باہر ہے کہ میں بھی بیوی کو محبوب تھا یا نہیں شوہر پرستی جن بیویوں کا شعار
ہے انھیں تو جانے دیجئے وہ مجھ سے بھی زیادہ خراب و رسوا اور زبوں خستہ
شوہروں کو مذہب کا ایک مقدس ہدیہ سمجھ کر قبول کر لیتی ہیں اس کے علاوہ
محبوبیت کا کوئی اور معیار ہو تو سولہ اور چالیس کے تفاوت کو سامنے رکھکر
آپ خود ہی اس مسئلہ کا فیصلہ کر دیجئے، میری خانہ آبادی سے تقریباً سب
ہی کو خوشی ہوئی مگر ایک غریب زہرہ ایسی عورت تھی جو یہ خبر سنکر اپنی بام
بلند پر سر پکڑ کر بیٹھ گئی زہرہ سے مجھے مدت سے انس تھا پھر بھی حادثہ
ازدواج پر مجھے اتنا صدمہ تو نہ تھا کہ سر پکڑ کر بیٹھ جانے کی ضرورت
پیش آجاتی البتہ دل تھا سنے پر میں بھی کچھ مجبور سا ہو گیا اس لئے نہیں
کہ مجھے عمر عزیز کے چالیس سال گذر جانے پر کوئی ملال تھا بلکہ اس
بنا پر کہ میں نے پورے تیس سال کے بعد زہرہ کے ایمانِ عشق کو ٹھکرا
کر کفر کا ارتکاب کیا تھا زہرہ سے مجھے عشق تو نہ تھا یا اگر تھا تو ایک دو
سال کے بعد ہی یہ خمار اتر گیا تھا لیکن ایک قسم کی ہلکی سی محبت ضرور تھی
جسے انس بھی کہہ سکتے ہیں وہ غریب ہمیشہ مجھے باور کراتی رہی تھی کہ میری
والہ و شیدا ہے اور اتنی ہی وفادار ہے جتنی ایک بیوی ہو سکتی ہے مگر میری
نگاہ میں ان طفل تسلیوں یا ابلہ فریبیوں کی کوئی وقعت نہ تھی کیونکہ میں

بھی حلف وفاداری اُٹھانے کے بعد روزانہ رات کی تاریکیوں میں متعدد مقامات پر عہد وفا کی دلیرانہ خلاف ورزی کے بعد اسے اپنی نیازمندی کا یقین دلانے کی کامیاب سعی کیا کرتا تھا مگر بات یہ ہے اس قسم کی رندانہ تفریح اور شادی میں زمین و آسمان کا تفاوت ہے اور اس فاصلہ کو محسوس کرنے کے بعد ہی زہرہ نے اس خبر کو حد درجہ حزن وملال کے ساتھ سنا اور سنتا ہوں کہ وہ ناگہانی موت کی حد تک پہونچکر اپنی سخت جانی یا میری بدقسمتی سے واپس آگئی یعنی زندہ رہ گئی رات کو دس بجے بلکہ اس کے کچھ بعد ہی میں اس تقریب شب سے فارغ ہو کر زہرہ کے یہاں پہونچا، وہ بیوہ بنی بیٹھی تھی گویا آج ہی اس کی رات میں غرق دریائے رحمت ہو چکا تھا، اس کے رخسار غازے کی مصنوعی رعنائیت زا دلفریبی سے اور ہونٹ ریاکارانہ سُرخی سے محروم تھے اور یہی بیوگی کی وہ علامات ہیں جو زہرہ ایسی سدابہار عورت میں نمودار ہو سکتی تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی وہ چیخ کر نیم بیہوش ہو گئی میں نے دوڑ کر سنبھالا بڑی مشکل سے وہ ہوش میں آئی اور سب سے پہلی فرصت گفتگو میں بولی، میں لٹ گئی ہائے تم نے مجھے کہیں کا نہ رکھا!

کیوں ہوا زہرہ؟

زخموں پر نمک مت چھڑکو، اس نے میری طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

ارے کہو تو سہی مُنہ سے کیا ہوا؟ میں نے گردن کو ایک رستمانہ جھٹکا دیکر کان کی خیر و عافیت کا مکمل انتظام کرنے کے بعد عرض کیا۔

تم نے شادی کر لی، شرم نہ آئی تمہیں، ارے لوگو میں لٹ گئی میں کہیں

کی نہ رہی۔

روتی کیوں ہو زہرہ! ذرا سوچو تو سہی اس حادثہ سے میرے اور تمہارے تعلقات محبت وخلوص میں کیا فرق پڑا اور میرے اور تمہارے درمیان کون سا پردہ حائل ہو گیا میں اور تم اب بھی وہی ہیں جو کل تھے میں پروانہ تم شمع، نہ میرے جذبۂ جاں سپاری میں کوئی کمی واقع ہوئی نہ تمہاری نور بیزی میں تمہاری جان کی قسم زہرہ میری اور تمہاری حیثیت میں کوئی فرق نہیں ہوا تمہیں یقین رکھنا چاہیئے کہ شادی میں نے گھر آباد کرنے کے لئے کی ہے دل کی آبادی تمہیں سے ہے وہ گھر کی مالک رہے گی اور تم دل پر قابض رہو گی اگر میں ایسا نہ کرتا تو بھی تمہیں میری جائداد میں حق وراثت نہ ہوتا اب بھی وہی صورت ہے پھر خدا کے لئے بتاؤ میں نے کیا خطا کی۔

ہاں میں خوب جانتی ہوں تم نے کیا قیامت ڈھائی ہے مجھ پر مجھے معلوم ہے آج جو گھر کی مالک ہے کل کو وہی دل پر بھی حکومت کرے گی میں نے ایسے ہزار ہا تماشے دیکھے ہیں، جو شخص دشمن کو بھگانا چاہتا ہے پہلے اس سے گھر چھینتا ہے پھر سب چیزیں خود بخود چھین جاتی ہیں۔

گھر تمہارے قبضہ میں تھا ہی کب زہرہ؟

تھا کیوں نہیں تمہاری کیا چیز میرے ہاتھ میں نہ تھی دولت دل گھر اور کاروبار سب میرا تھا!

زہرہ اگر حاکم عدالت کوئی مجھ جیسا حسن پرست اور عاشق مزاج مل جاتا تو میں نہیں کہہ سکتا فیصلہ کیا ہوتا ورنہ باور کرو میرے مرنے پر میرے تجربہ کار بوڑھے اور مقدمہ باز اعزہ تمہیں میری ہر چیز سے آسانی کے

ساتھ محروم کردیتے۔
اور اب تو تم نے اپنے جیتے جی ہی مجھے محروم کر دیا۔ دیر تک زہرہ روتی اور بچھاڑیں کھاتی رہی پھولوں اچھا میں آج تمہیں نہ جانے دوں گی یہاں سے!
کیوں؟ اگر میرے اس عمل سے طلاق کا کام نکل سکے تو مجھے کوئی عذر نہیں ورنہ اس شوہرانہ بداخلاقی پر مجبور نہ کرو وہ بیچاری کیا کہے گی دل

میں ؟
کچھ کہے جی۔ ابھی سے تمہیں اس کا اتنا درد ہو گیا۔ میرا اتنا حق بھی نہیں رہا اب ہائے قسمت! اس نے زور سے پیشانی پر ہاتھ مار کر کہا اور مجھے غور سے دیکھنے کی ضرورت پیش آئی کہ اس کے طلائی کڑوں کی ضرب شدید سے کہیں ماتھے پر کوئی نیل تو نہیں پڑ گیا۔
کہو یہیں رہو گے، وعدہ کرو جی!——— وہ جھنجلا کر بولی اور مجھے قطعی اندیشہ پیدا ہو گیا کہ اس مرتبہ کہیں منہ پر طمانچہ نہ مار دے مگر ایسا نہیں ہوا اور وعدہ کرنے پر یہ بلا ٹل گئی میں نے اسے یقین دلاتے ہوئے کہا اچھا میں یہیں رہونگا ہرگز نہ جاؤں گا!
قسم کھاؤ جی، تمہارا اعتبار ہی کیا نجانے کس وقت چل دو شیروانی اٹھا کر، ارے تمہیں خوف خدا نہیں آتا میرا دم گھٹا جا رہا ہے اللہ کیا مصیبت ٹوٹ پڑی مجھ پر! اس نے ہونٹ چبانے بلکہ کاٹتے ہوئے کہا۔
تمہاری جان کی قسم نہ جاؤں گا میں نے کہا۔

میری جان اب کے کوڑی کی رہی اپنی جان کی قسم کھاؤ اور اُس خوش نصیب کے سر کی قسم کھاؤ جسے آج بیاہ کر لائے ہو۔

اس کا نام ہی بھول گیا؟

نکاح میں نام نہ لیا گیا ہوگا؟

ہاں وہی تو بھول گیا میرے دل پر تو تمہارا نام لکھا ہے زہرہ!

بس رہنے دو فضول جھوٹی باتوں سے کیا فائدہ؟

ادھر تازہ زخم تھا اور ادھر تازہ شکار جس کے نکل بھاگنے کا کوئی خطرہ ہی نہ تھا پھر بھی مجھے کشمکش تھی آخر کروں تو کیا کروں کس کی خبر گیری کروں اور کس سے معذرت کروں بظاہر غیریت اسی میں تھی کہ زہرہ کی خوشنودی مزاج ملحوظ رکھوں جو مجھ سے دست و گریبان ہونے کی اہلیت بلکہ طاقت رکھتی تھی بیوی غریب میں یہ ہمت کہاں تھی کہ مجھ ایسے تجربہ کار اور جہاندیدہ شوہر کی طرف آنکھ بھر کر دیکھ سکتی بہرحال میں نے زہرہ کی پائینتی پر ہی رات بسر کردی رات کو ایک منٹ کے لیئے بھی نیند نہ آئی اس غیر حاضری پر جس قسم کی بدگمانیاں پیدا ہو سکتی تھیں ان کے خطرات پیش نظر تھے اُدھر اس معصوم کے دل کی ننھی سی کلی کو پاؤں سے روند ڈالنے کی ظالمانہ حرکت پر پشیمانی تھی زہرہ میرے سر نیاز کو اپنے پائے ناز پر دیکھکر خوش تھی اسی لیئے کئی گھنٹے تک آرام سے سوتی رہی مگر میں سمجھ رہا تھا کہ وہ کوشش کرکے مجھے اس حد تک پہنچا رہی ہے کہ میں حجلۂ عروسی تک پہنچنے کے قابل ہی نہ رہوں، صبح ہوتے ہی میں نے زہرہ سے کہا۔ زہرہ اب تو اجازت

ہے مجھے؟
ابھی سے، ابھی تو مرغ بھی نہیں بولا!
ارے اب تو ملا بھی بول چکا۔
پھر اب کیا کروگے جاکر؟
کچھ نہیں بس معذرت کرونگا!
اچھا جاؤ۔ مگر دیکھو رات کو پھر یہیں رہنا ہوگا۔
تم بالکل مطمئن رہو!
میں جلدی جلدی شیروانی پہنتا ہوا زینہ نیچے اُتر گیا اور خدا خدا کرکے میں نے اس حبس بیجا سے نجات پائی گھر پہنچا تو کوئی جاگ رہا تھا کوئی سو رہا تھا میں جلدی سے اپنے کمرے میں چلا گیا میں نے یہاں جو منظر دیکھا اسے کبھی نہ بھول سکوں گا۔ انا میری مسہری کے قریب فرش پر پڑی خراٹے لے رہی تھی اور ایک مجسمۂ معصومیت اور پیکر ایثار عروسی لباس پہنے سر کو گھٹنوں پر رکھے مسہری کے وسط میں بجس و حرکت بیٹھی تھی یہ دیکھتے ہی میرے دل پر ایک چوٹ سی لگی۔ نہایت سخت چوٹ میں سر سے پیر تک کانپ گیا، کیا یہ غریب رات بھر یونہی بیٹھی رہی، ضرور بیٹھی رہی ہوگی کمرے میں خوشبوئیں آوارہ پھر رہی تھیں، آوارہ اور سوگوار، ہر تصویر ہمدردی اور غمخواری سے میری بیوی کو تک رہی تھی، لیمپ روتا ہوا نظر آرہا تھا، اس کی ابھری ہوئی روشن بتی سسکیاں بھر رہی تھی، میں نے اس کے نرم و نازک شانہ کو ہلا کر پوچھا کیا تم یونہی بیٹھی رہی ہو رات بھر؟

مجھے اس کا کوئی جواب نہ ملا البتہ دوپٹہ منہ سے ہٹا کر دیکھا تو آنسوؤں کی مسلسل جھڑی نے میرے خیال کی تصدیق کی، میں نے اپنے اوپر بہت ملامت کی تمہاری کمر دکھنے لگی ہوگی بیٹھے بیٹھے؟ —— میں نے پوچھا مگر وہ کچھ نہ کہہ سکی —— اچھا کمر نہیں تو دل ضرور دکھا ہوگا تمہارا؟ اس نے پھر بھی کچھ نہ کہا مگر اس کی معصومیت اور شرافت کی یہ قربانی رائگاں نہ گئی، میرے قلب و دماغ میں ارادوں کی قوتیں بیدار ہوگئیں اور محبتوں کے ساز بجنے لگے،

زہرہ کے جبر مہربانہ اور اس کی بداخلاقی کے باعث مجھے اس سے نفرت ہوچکی تھی اور اب اس کے گھر کیطرف میرے پاؤں اُٹھتے ہی نہ تھے تاہم پاس وضع سے میں نے فوراً تبدیلی روش مناسب نہ سمجھی اور اوپری دل سے اُسے اپنی محبت کا یقین دلاتا رہا رفتہ رفتہ مجھے معلوم ہوگیا سونے اور ملمع میں کیا فرق ہے اب تک میں نے ملمع ہی کا کاروبار کیا تھا حقیقت کا مزہ چکھا ہی نہ تھا اب کام و دہن اس لذت سے آشنا ہوچکے تھے اس لئے قدرتاً زہرہ سے مجھے مستقل تنفر ہوگیا اب اس کا نام سنکر ہی مجھے اذیت ہوتی تھی میں نے اس استخوان بے مغز کو پھینکدیا اور پھر کبھی منہ سے نہ لگایا اب اس سے مقدمہ بازی ہو رہی ہے زہرہ نے مجھ پر مہر کا دعویٰ کیا ہے اور یہ ثبوت بہم پہنچانے کی کوشش کر رہی ہے کہ میں نے اسے بیوی بنالیا تھا، میری بیوی کا اب بھی اصرار ہے کہ کسی کا دل توڑنا اچھا نہیں کبھی کبھی ہو آیا کرو لیکن اب یہ بات میرے قابو سے باہر ہے۔

حُسن فروش کا شب نامچہ

شام کے سات بجتے ہی میں روزانہ جوان بنجایا کرتی ہوں۔ ویسے تو ماشاءاللہ سچ مچ جوان ہوں۔ سترہ اٹھارہ برس کی عمر ہی کیا ہوتی ہے جوانی پر اچھی طرح بہار بھی نہیں آتی۔ مگر یہاں جوانی سے میرا مطلب ہے زیب و زینت کی جوانی اور غازہ گری یا فریب کاری کیلئے تل کر بیٹھنے کا مصنوعی طریقہ، جس کے لئے ایک حسن فروش کو پوری فن کاری بلکہ فن کارانہ مہارت کی ضرورت ہوا کرتی ہے اور وہ ہمیشہ عشق و شباب کے تاروں کو حُسن کی مضراب سے چھیڑنے کی نیت سے عین اس وقت جب دن اور رات گلے ملا کرتے ہیں۔ ایک عارضی اور مصنوعی شباب اپنے اوپر طاری کر لیا کرتی ہے، اور پھر اسکی آنکھیں چمکنے لگتی ہیں، بالوں کی ترچھی مانگ اچھی خاصی ناگن بن جاتی ہے۔ مرجھائے ہوئے گال سُرخ ہو کر دلفریب ہو جاتے ہیں اور ہونٹ چاہے رس سے بالکل ہی خالی ہوں مگر ایک گہری سُرخی کی مصنوعی جھلک انہیں جوانی کے میٹھے پن اور ہونٹوں کی سی قدرتی خوبصورتی میں تبدیل کر دیتی ہے۔ اس انداز سے ایک عورت جو کچھ دن پہلے صحیح معنوں میں کتاب فطرت کا ایک سادہ ورق تھی۔ نقش و نگار سے مزین ہو کر ریا کاری — صنعت اور چند دوسرے بدترین اوصاف کا مجسمہ بن جاتی ہے۔ اس کی آنکھوں سے زندگی اور انسانیت کی جگہ موت اور شیطنت ٹپکنے

لگتی ہے، اس کا دل حقیقی محبت سے خالی ہو کر ہنگامی اور صنفی جذبات سے بھر جاتا ہے جیسے شیشہ کی سفید بوتل سے کوئی خوشبودار شربت نکال کر اس میں رنگین شراب بھر دی جائے۔

میں غسل خانے سے نکلی اور سیدھی آئینہ کے سامنے چلی گئی اور اپنے کالے بھونرا سے بال جن میں ابھی پانی کی نمی باقی تھی۔ شانوں پر بکھیر دیئے پھر انہیں تولیہ سے خشک کر کے، زلف بنگال سے معطر کیا، رخساروں پر غازہ ملا ہونٹوں کی عنابیت کو مصنوعی سرخی لگا کر دہکتے ہوئے انگاروں میں تبدیل کیا اور پھر قیامت بن کر باہر کے کمرے میں آ بیٹھی۔ جو حسن کی نمائش کے لئے مخصوص تھا۔۔۔۔۔۔ اور اگر آپ مجھے آفتاب کہہ سکیں تو اس کمرہ کو افق مشرق کہنا موزوں ہوگا۔"

میرا شروع ہی سے یہ عقیدہ تھا کہ دنیا کے سارے کام کسی نہ کسی مجبوری کی بنا پر چلا کرتے ہیں۔ مجبوریاں نہ ہوں تو بہت سے اچھے اور برے کام بند ہو جائیں اور دنیا نہ معلوم کیا بن جائے۔ میرے ساتھ بھی کچھ مجبوریاں تھیں، جنہیں یہاں بیان کرنا مناسب نہیں اسی وجہ سے طبیعت کی بلندی اور نکل پسندی کے باوجود میں سیاہ کاری کے جسن دہکتے ہوئے دوزخ میں جھونک دی گئی تھی۔ اس میں ایک نامعلوم مدت تک میرا پڑا رہنا ضروری تھا۔ مگر میں اپنے ذلیل ماحول کی پستیوں سے مانوس اور ان کی خوگر نہ ہوئی تھی۔ میری مثال بالکل اس چڑیا کی سی تھی جس کے پر نوچ کر چھوڑ دیا گیا ہو اور وہ کسی اونچی جگہ پہنچنے کی کوشش میں کسی ناپاک، متعفن اور

اندھیرے مقام پر جا پڑے۔ اور صرف زندہ رہنے کے لئے وہاں جو غذا بھی اسے میسر آئے کھاتی رہے ـــــ بہر کیف میں مجبور تھی مگر میری فطرت تبدیل نہ ہوئی تھی۔ نگاہوں کی معصومیت ممکن ہے فنا ہو گئی ہو، مگر ضمیر میں پاکیزگی باقی تھی۔ عادات وخصائل کی پاکیزگی تو میں بہت حد تک کھو چکی تھی البتہ فطرت کا نور چمک رہا تھا اور اس کا زنگ کسی رگڑ کا منتظر تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میری گردش نگاہ اور شوخی کلام اس حد پر نہ پہونچی تھی جہاں پہنچ کر آنکھوں کو رہزنی اور زبان کو نشتر زنی جائز ہو جاتی ہے نہیں اوپر بیٹھ کر نیچے کبھی نہ دیکھتی تھی۔ نہ راستہ چلنے والے نوجوانوں کی پیاسی اور للچائی ہوئی نگاہوں کا میرے پاس کوئی جواب ہوتا تھا، لوگ پتھر کے ایک مجسمہ کی طرح مجھ پر نظر ڈالتے اور گزر جاتے ہیں تو "نمائش حسن" کا فرض ادا کرنے ایک جگہ بٹھا دی جاتی تھی۔ اور اب کچھ دنوں سے عادتاً خود ہی آ بیٹھتی تھی۔ لیکن آج میں نے بازار پر ایک پھسلتی ہوئی نگاہ ڈالی، اچٹتی ہوئی ایک سرسری سی نگاہ! سڑکوں پر آدمیوں کا ایک سیلاب تھا۔ جو اپنی مخصوص روانی کے ساتھ بہتا جا رہا تھا۔ اس بھیڑ میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی، مردوں میں ایسے بھی تھے۔ جو دانستہ اوپر دیکھنے سے گریز کرتے اور آنکھیں جھکائے جلدی جلدی گذر جاتے اکثر ایسے تھے کہ مجھے دیکھتے اور پھر دیکھتے ہی رہتے۔ وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں کیا کچھ کہتے۔ اپنے سوال کا جواب مانگتے اور بازار میں ایک ترنم چھوڑ کر آگے بڑھ جاتے اور بعض کا تو کام ہی یہ تھا کہ سر میں تیل اور گلے میں ہار ڈال کر

ایک محدود رقبہ میں گھومتے رہیں، اور جب موقع ملے اپنی بے تکی الاپ سے بازار کے غل و شور میں اضافہ کردیں، اس قسم کے لوگوں سے مجھے ہمیشہ نفرت رہی، ان سب کے علاوہ اس بھیڑ میں کاروباری لوگ اور مزدور بھی تھے جو بالکل میری طرح اپنا اپنا فرض ادا کر رہے تھے کوئی جھکتے ہوئے پھولوں کے ہار بیچ رہا تھا، کوئی ٹھنڈا شربت بنا کر پلا رہا تھا۔ کسی کے سر پر گلے سڑے پھلوں کی ڈلیا رکھی ہوئی تھی اور وہ سُریلی آوازیں فضا میں پھیلاتا ہوا۔ اِدھر سے اُدھر نکل جاتا تھا۔ غرض طرح طرح کی چیزیں بک رہی تھیں اور گوناگوں صدائیں بلند ہو کر اونچے اونچے مکانوں کی دیواروں سے ٹکرا رہی تھیں۔ میں کسی چیز کی طرف متوجہ نہ تھی بس بُت بنی بیٹھی تھی۔ پھر بھی میری نگاہیں غیر شعوری طور پر بھیڑ کا جائزہ لے رہی تھیں۔ میری آنکھوں میں آج ایک خاص قسم کا تجسس تھا۔ دل میں کچھ عجیب سی الجھن تھی۔ میں بالکل نہیں بتا سکتی یہ سب کچھ کیوں تھا ـــــــ اب میں غور سے آنے جانے والوں کو دیکھ رہی تھی، جن میں اکثر خود مجھے دیکھ رہے تھے۔ میں نے دیکھا ایک خوبصورت نوجوان جس کے چہرے پر شاندار ڈاڑھی تھی، عینک لگائے بار بار میرے کوٹھے کے نیچے سے گذر رہا ہے۔ ایک طرف سے آتا ہے اور اوپر دیکھتا ہوا دوسری طرف چلا جاتا ہے میں سمجھ گئی یہ کیوں اپنا وقت ضایع کر رہا ہے۔ میرے دل میں اس کے ساتھ ہمدردی کا ایک گہرا جذبہ پیدا ہوا اور میں نے دل ہی دل میں کہا خدا کرے یہ میرے یہاں نہ آئے اسکی صورت

سے شرافت نمایاں تھی، اور چوڑی پیشانی جس پر ایک نور سا جھلک رہا تھا۔ اُس کے دل کی صفائی کو ظاہر کر رہی تھی ——— دفعتہً زینہ پر جوتوں کی آہٹ ہوئی، میرا دل دھڑکنے لگا۔ میں سمجھ گئی وہی نوجوان میرے یہاں آرہا ہے ——— واقعی وہی تھا۔ جو نہایت بدحواسی کے ساتھ میرے کمرے میں آگیا تھا۔ اس کا سانس پھولا ہوا تھا، چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ غالباً وہ ایک نو گرفتار پرند کی طرح جال میں پھنس کر پھڑپھڑانا چاہتا تھا۔ وہ اس ماحول میں کچھ گھٹن سی محسوس کر رہا تھا ——— میں نے حسب معمول ذرا جھک کر اپنا داہنا ہاتھ پیشانی پر رکھدیا۔ اور ایک حسین مسکراہٹ آپ ہی آپ میرے ہونٹوں پر دوڑ گئی۔ نووارد کی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں۔ اس کے پیروں میں ہلکی سی لرزش تھی۔ جیسے وہ کسی خوفناک جرم کا ارتکاب کرنے والا ہو۔

میں نے کہا تشریف لائیے!!

——— حضور بیٹھئے!!

وہ فرش کے ایک کونہ پر جوتہ پہنے پہنے اس طرح بیٹھ گیا گویا کمرے کی کوئی چیز اُٹھا کر بھاگ جانے لگا۔ میں نے کہا آرام سے بیٹھئے، ڈریئے نہیں!

جی ہاں میں آرام ہی سے بیٹھا ہوں، اس نے بھنچی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

پاندان میرے سامنے ہی رکھا تھا۔ ایک بیڑا بنا کر میں نے تھمالی

ین رکھا اور اُس کی طرف سرکاتے ہوئے بولی
کھائیے!

اس نے شرمیلے انداز سے مجھے دیکھ کر آنکھیں نیچی کر لیں اور پان اُٹھا کر منہ میں رکھ لیا، نوجوان کی اکثر ادائیں مجھے پسند آ رہی تھیں۔ اور یہ پہلا موقع تھا۔ کہ میرے مصنوعی طرز عمل میں بھی حقیقت کا گہرا رنگ موجود تھا، میں اور لوگوں کی طرح اس سے اوپری دل سے باتیں نہیں کر رہی تھی بلکہ میرا جی چاہتا تھا کہ وہ میرے سامنے یونہی بیٹھا رہے اور میں اُس سے باتیں کرتی رہوں۔ یہ بات بالکل صاف تھی کہ نوجوان آج پہلی مرتبہ اس جال میں پھنس رہا تھا مجھے اس پر بہت زیادہ ترس آ رہا تھا۔ میں اس کے ساتھ کسی قسم کا تصنع برتنا نہ چاہتی تھی۔ میں نے ہاتھ پکڑ کر اُسے قالین پر بٹھا لیا پھر ہنس کر پوچھا
"دولت خانہ کہاں ہے؟

یہ کیوں پوچھتی ہیں آپ؟

اس لئے کہ آپ نے مجھ پر کرم فرمایا ہے میں کم سے کم اتنا ہی پوچھ لوں کہ آپ رہتے کہاں ہیں!

میں اپنا پتہ آپ کو نہیں بتاؤں گا۔ اس نے بڑی سادگی کے ساتھ جواب دیا۔

کیا آپ کا خیال ہے کہ میں آپ کے گھر کوئی خط بھیج دونگی۔ اچھا گھر نہ بتائیے اپنا نام تو بتا دیجیے۔ مجھے یہ تو معلوم ہو جائے میرا مخاطب

کون ہے۔؟

نام پوچھنے سے بھی کوئی نتیجہ نہیں!

کیوں ــــ؟ میں پولیس میں رپورٹ تو لکھانے سے رہی ـــــ؟

میرے نام اور پتہ سے آپ کو کیا بحث آپ کسی ہوٹل کی منیجر نہیں ہیں

نہ میں مسافر کی حیثیت سے آپ کے یہاں قیام کرنا پسند کروں گا،

پھر ان باتوں سے نتیجہ؟ وہ کچھ زچ ہو کر بولا۔

آپ کو ناگوار ہوتا ہے تو رہنے دیجئے ـــــ معلوم ہوتا ہے آپ

پہلی بار اس کوچہ میں پاؤں رکھ رہے ہیں۔

ہاں یہی سمجھئے!

خدا کرے آئندہ کبھی آپ نہ آئیں!

کیوں اس نے چونک کر پوچھا۔

اس کا کوئی جواب میرے پاس نہیں!

اس کا جواب نہیں تو آپ یہ جال ڈال کر بیٹھی ہی کیوں ہیں؟

میں اس کا بھی کوئی جواب نہیں دونگی۔

کیا آپ مجھ سے مذاق کرتی ہیں۔

بالکل نہیں میں صرف مذاق کا جواب دیتی ہوں۔

وہ دیر تک مسکراتا رہا کچھ کہنے کی ہمت نہ ہوئی جب گھبراہٹ ذرا کم ہوئی تو اس نے گفتگو شروع کی اور مجھ سے بڑی احتیاط کے ساتھ شرماتے ہوئے پھر کچھ پوچھا۔

میں نے کہا میں کوئی جواب نہیں دونگی۔

کیوں؟

اس لئے کہ آپ میری کسی بات کا جواب نہیں دیتے۔

اچھا پوچھئے کیا پوچھتی ہیں آپ؟

آپ کا نام؟

فرض کیجئے میں صحیح نام نہ بتاؤں؟

مجھے آپ سے اس فریب کی اُمید نہیں آپ اس دھوکہ کو جائز رکھتے تو پہلے ہی فرضی نام بتا دیتے۔

میرا نام انیس الدین ہے۔ وہ ہنسکر بولا کہئے تو ولدیت بھی بتاؤں؟

نہیں اس کی ضرورت نہیں۔ وطن کہاں ہے آپ کا؟

یہ کیوں پوچھتی ہیں آپ؟

میں خود نہیں بتا سکتی کیوں پوچھ رہی ہوں۔ میں سمجھتی ہوں اس وقت میں آپ کو بھیڑ میں سے ڈھونڈ لائی ہوں۔ آپ کے آنے سے مجھے کچھ تسکین سی محسوس ہو رہی ہے۔ بس ان سوالات کا مقصد یہی سمجھئے کہ مجھے زیادہ سکون کی ضرورت ہے۔

غریب خانہ انبالہ ہے؟

انبالہ؟ —— میں کچھ دیر کے لئے خاموش ہو گئی۔ ماضی کے دھندلے نقوش آہستہ آہستہ میری آنکھوں کے سامنے ابھر رہے تھے، جیسے دور بہت دور کوئی باغ نظر آئے اور پھر بتدریج وہ قریب

آتا جائے یا جس طرح گھر کے دھندلکے میں صبح کے ستارے کی لرزتی ہوئی جگمگاہٹ! انبالہ کے درودیوار میرے سامنے بکھر رہے تھے انھیں میں میرا گھر بھی تھا۔ ایک لمبی سڑک پھیلتی جارہی تھی۔ اس کے موڑ پہ میرا گھر چمک رہا تھا۔ بھولا بسرا گھر، اندر کمرے میں اماں جان پڑی سو رہی تھیں اور میں بند الماری کو چپکے چپکے کھول کر چاکلیٹ نکالنے کے لئے ہاتھ بڑھا رہی تھی دفعتہً اماں جاگ پڑیں اور آنکھ کھول کر پوچھا کون؟ ———

رضیہ! میں ایک دم سے اچھل پڑی اور گھبرا کر میں نے کہا انبالہ ——؟

جی ہاں انبالہ —— انبالہ کا نام سنتے ہی آپ کہاں پہنچ گئیں؟

کہیں نہیں میں یہیں تھی اور آپ کا نام انیس الدین ہے نا؟

جی ہاں، لکھ دوں؟

نہیں لکھنے کی ضرورت نہیں مگر مہربانی کر کے اب ولدیت بھی بتا دیجئے اپنی۔

میرے والد کا نام ضمیر الدین ہے نوجوان نے پیشانی سے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا۔

ضمیر الدین! کون ضمیر الدین وہی نا جو پولیس میں انسپکٹر تھے۔

جی ہاں وہی نوجوان اب زیادہ گھبرا رہا تھا۔

کیا آپ انھیں جانتی ہیں۔

خوب اچھی طرح! —— وہ میرے سگے ماموں تھے۔ میں آپ کو اپنا نام بھی بتائے دیتی ہوں سنئے:۔

کسی زمانہ میں میرا نام رضیہ تھا۔ یہی میرا اصلی نام ہے اور اب تو میں معلوم نہیں کن کن ناموں سے مشہور ہو چکی ہوں ہر شہر میں میرا نیا نام رکھا جاتا ہے۔

رضیہ؟ نوجوان نے پوچھا۔ اس کے چہرے کا رنگ سیاہ ہوتا جا رہا تھا۔ مگر وہ تو مر چکی تھی!

اب زندہ ہو گئی کیا آپ نے کبھی رضیہ کو دیکھا تھا؟

ہاں بچپن میں دیکھا تھا اُس وقت ہم دونوں ذرا ذرا سے تھے۔

اب جوانی میں بھی دیکھئے اور بیوی بنا کر جو کام اس سے نہ لے سکے وہ ...... میں نے غصہ کو ضبط کرتے ہوئے بھاری سی آواز میں کہا میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ میں محسوس کر رہی تھی کہ میرا چہرہ آہستہ آہستہ پھولتا جا رہا ہے اور ممکن ہے جلد ہی متورم ہو کر پھٹ جائے

انیس پر بھی بدحواسی طاری ہو گئی وہ بالکل پاگل ہو گیا۔ ایسا معلوم ہوا اُسے دفعتہً کسی نے اٹھا کر دو منزلہ سے نیچے پھینک دیا۔

انیس تمہارے باپ نے مجھے تباہ کر دیا، میرا دین بھی برباد ہوا، اور دنیا بھی، میں کہیں کی نہ رہی میرا لقدر روپیہ اور میری جائیداد جو میری بیوہ ماں نے مرنے کے بعد چھوڑی تھی ہتھیانے کی غرض سے ماموں جان نے مجھے خالہ اماں کے پاس بھیج دیا تھا میں وہاں پلتی بڑھتی رہی خالہ جان پوری شفقت کے ساتھ مجھے پرورش کر رہی تھیں وہ کہا کرتی تھیں میری بہن نے مرتے وقت وصیت کی ہے کہ رضیہ کی شادی

انیس کے ساتھ کی جائے۔ بدقسمتی سے خالہ مرگئیں اور پھر میرے سر پر ہاتھ رکھنے والا کوئی نہ تھا۔ ماموں نے مجھے ٹھکرا دیا۔ ان کے نزدیک میں اپنے ماں باپ اور خالہ کو کھا گئی تھی۔ وہ ڈرتے تھے کہیں انھیں بھی نہ کھا جاؤں۔ میں نہیں کہہ سکتی درمیانی زندگی میں نے کیونکر بسر کی۔ البتہ یہ مجھے معلوم ہوگیا تھا کہ ماموں جان نے انیس کی بات ایک اونچے اور متمول خاندان میں پکی کر لی ہے وہ بد بخت ماں باپ کی بدبخت لڑکی کو اپنی بہو بنانا پسند نہیں کرتے۔ میں در در کی ٹھوکریں کھا کر پگڈنڈی کے اس پودے کی طرح جو پیروں میں روندے جانے کے بعد بھی ابھر کر پنپتا رہتا ہی رہتا ہے عمر کی دشوار منزلوں کو طے کرتی رہی۔ حتیٰ کہ جوان ہوگئی زندگی کے اس دوراہے پر پہنچ کر جہاں موت و حیات کی دو شاہراہیں آکر ملتی ہیں۔ دنیا نے زبردستی مجھے موت کے راستہ پر ڈھکیل دیا۔ میں اب تک اسی اندھیری سڑک پر ٹٹولتی پھر رہی ہوں۔ انیس میں چاہتی ہوں تم میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے زندگی کی شاہراہ پر لگا دو۔ میں تم سے اپنا روپیہ یا اپنی جائیداد نہیں مانگتی ذرا سی مدد چاہتی ہوں ـــــ مجھے اس گہرے غار سے سہارا دیکر نکال لو! ـــــ معلوم نہیں وہ کون سی طاقت تھی جو نہایت روانی اور اثر کے ساتھ مجھ سے یہ الفاظ کہلا رہی تھی، آنسو میری آنکھوں سے ٹپک رہے تھے گلا بند ہوا جارہا تھا۔ مگر زبان تھی کہ اپنا کام کر رہی تھی۔ انیس میری باتوں سے بہت متاثر ہوا، اس نے نہایت وثوق کے ساتھ پوچھا۔

رضیہ تم میرے ساتھ چلنے کو تیار ہو؟

ہاں بشرطیکہ تم کسی کو نہ بتاؤ کہ میں کون ہوں اور مجھے اپنی خدمت
........)

مجھے تمہاری دونوں شرطیں منظور ہیں۔ لیکن تم بہت زیادہ ستائی ہوئی ہو۔ میرے گھر سے تمہارے ساتھ گہری سازشیں کی گئی ہیں۔ اس لئے میں صاف طور پر بتائے دیتا ہوں۔ کہ میری ایک بیوی موجود ہے یہ معلوم کرنے کے بعد بھی اگر تم مجھ سے شادی کرنے پر رضامند ہو تو اس کے یہ معنی ہیں کہ تم ایک دوزخ سے نکل کر دوسرے جہنم میں گرنے کے لئے اپنی خوشی سے تیار ہو رہی ہو —— اس موقعہ پر میں یہ بتائے دیتا ہوں کہ میرے والد نے جواب پنشن پانے کے بعد انتقال کر چکے ہیں۔ محض دولت کی طمع میں میری منشاء کے خلاف ایسی جگہ میری شادی کر دی تھی۔ جو دولت و ثروت اور نام و نمود میں ہم سے بہت اونچی تھی۔ پھر بد قسمتی سے بیوی نہایت بدمزاج ہی نہیں وہ انتہا درجہ کی بدصورت بھی ہے، اس کی نظر میں میری حیثیت کتے کے برابر بھی نہیں۔ جس دن سے شادی ہوئی ہے۔ میری زندگی تلخ ہو گئی ہے۔ اور میں موت کو جینے پر ترجیح دے رہا ہوں گھر میں ایک لمحہ سکون کا ہاتھ نہیں طلاق دیتے ہوئے ڈرتا ہوں تمام سسرالی اعزہ بڑے بڑے دوں پر کام کر رہے ہیں۔ نہ معلوم سب ملکر کیا فساد برپا کر دیں۔ پانچ ہو گئے آج تک میرے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ میں نہیں جانتا

ازدواجی مسرتوں کا دنیا میں کوئی وجود ہے بھی یا نہیں ——— اب تک جس طرح ہو سکا نیک نیتی کے ساتھ نباہ کرتا رہا اور دنیا کو تج کر مذہب پر آنچ نہ آنے دی۔ لیکن انسان ہوں، دل رکھتا ہوں اس میں جذبات اور خواہشات کا ایک سمندر بھی موجزن ہے کئی روز سے دماغ میں مختلف قسم کے خیالات آرہے تھے آج معلوم نہیں کیا سوچ کر تمہارے دروازے پر آگیا تھا۔ آیا تو تھا تباہی مول لینے مگر زہے نصیب کہ زندگی اور کامیابی ہاتھ آگئی ——— رضیہ مجھے یہ کہنے میں بالکل شرم محسوس نہیں ہوتی کہ میرے باپ نے محض طمع کی خاطر تمہیں برباد کیا اور ان کے اسی جذبہ نے مجھے بھی اسی راستہ پر ڈال دیا تھا۔ لیکن تم نے رحمت بن کر مجھے بچا لیا۔

صبح تک ہم دونوں باتیں کرتے رہے ——— دن نکلتے ہی لوگ یہ دیکھ کر حیران ہو رہے تھے۔ کہ میں نے اپنا تمام سامان سڑک پر اکٹھا کر لیا ہے اور مالک مکان کرایہ وصول کرنے کے بعد اپنے مکان کے دروازے میں تالا ڈال رہا ہے ——— کئی سال کی گمراہی کے بعد میں منزل پر پہنچ گئی تھی، نہیں بتا سکتی کہ زندگی کے اس انقلاب سے مجھے کتنی خوشی میسر ہوئی تھی!

تمام شد